رجسٹر نمبر ایل ۵۳۴۰

جلد ۵۰ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۰	بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

ترجمان القرآن کی دو مختلف اشاعتوں میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ایک مومن کا اپنے رب کے ساتھ، اور اُس ذات پاک کے ساتھ جس نے ہمیں اپنے خالق اور مالک کے وجود کا صحیح شعور اور احساس بخشا ہے، کیا تعلق ہونا چاہیے۔ اس اشاعت میں ہم اس سلسلہ بحث کی آخری کڑی یعنی اس دنیا اور اس کے مال و متاع سے انسان کے تعلق کی نوعیت پر چند معروضات پیش کریں گے۔

اس دنیوی زندگی پر بحث کرتے ہوئے اسلام ہمیں سب سے پہلے اس کی اصل حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے بیشمار فتنے ایسے ہیں جو اس کو صحیح طور پر نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلی ہدایت جو اُس نے فرمائی ہے وہ یہ ہے:-

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ط وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۶:۴)

دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے حقیقت میں آخرت ہی کا مقام اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لو گے۔

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۷:۲۱)

آخرت کی قیام گاہ خدا ترس لوگوں کے لیے بہتر ہے کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳:۳)

اور یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ

اور یہ دنیوی زندگی (فی نفسہٖ) بجز لہو و لعب کے اور

لعبٌ وان الدار الآخرۃ لہی الحیوان لو کانو ایعلمون ۔ (۲۹-۶)

کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی تو عالم آخرت ہی ہے۔ کاش ان کو اس حقیقت کا علم ہوتا۔

اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے :-

وعن انس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اللّٰھم لاعیش الا عیش الآخرۃ ۔ (متفق علیہ)

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! اصلی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے ۔

وعن المستورد بن شداد رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما الدنیا فی الآخرۃ الا مثل ما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم فلینظر بم یرجع (رواہ مسلم)

حضرت مستورد بن شداد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ایسی ہی نسبت ہے جیسے سمندر میں کوئی اپنی انگلی ڈالے اور دیکھے کہ اس پر کیا تری لگی ہوئی ہے۔

قرآن پاک کی یہ آیات اور سرور کائناتؐ کی یہ تصریحات سب اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ایک مومن و مسلم کی اصل زندگی اس عارضی زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے لیکن چونکہ اس حیاتِ جاودانی کا راستہ اس عارضی زندگی کے بیابانوں میں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ایک مسلمان اس بات کے لیے مجبور ہے کہ وہ اسے طے کرے ۔ مگر اُسے ہر لمحہ اور ہر لحظہ یہ خیال ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیکھو کہیں اس زندگی کی رنگینیاں اور دلچسپیاں تمہیں مفتوح نہ کرلیں اور تم اس کے مکروفریب میں آکر کہیں اسے ہی منتہائے مقصود نہ سمجھ بیٹھو۔ قرآن حکیم اور احادیث میں اس حقیقت کی طرف مختلف طریقوں سے اشارہ فرمایا گیا ہے ۔

اِعْلَمُوٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا

تم خوب جان لو کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی محض لہو و لعب ہے اور ایک ظاہری زینت اور ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے میں تفوق جتلانا ایسا ہے جیسے کہ مینہ برسنا ہو

وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۔ (۵۷ : ۲۰)

اس کی پیداوار کفار کو اچھی لگتی ہے۔ پھر وہ خشک زور پر آتا ہے۔ پھر تم اس کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگی تو محض دھوکے کا سبب ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۔ (۳۵ : ۵)

اے اہل ایمان بیشک اللہ کا وعدہ سچا اور برحق ہے۔ (خبردار) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ کے معاملے میں کسی فریب میں مبتلا نہ کر دے۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۔ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ ۔

(۱۰ : ۲۴-۲۵)

دنیا کی زندگی (جس کے نشے میں بدمست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں (تم اس ناپائدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ (۳-۳)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں — بڑی ہی خوش آیند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ دار السلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

قرآن مجید نے صرف اس دنیوی زندگی کی بے حقیقتی کی وضاحت کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے واشگاف الفاظ میں یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اس زندگی پر راضی ہو گئے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس میں بالکل واضح الفاظ میں کہا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے، اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا اُن برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور طرزِ عمل کی وجہ سے) کرتے تھے۔

اسی طرح دنیا پرستوں کو گمراہ ٹھیراتے ہوئے انہیں ایک دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے:

وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ۔ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا ط اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ۔ (۱۴:۲)

اور سخت تباہ کن سزا ہے قبولِ حق سے انکار کرنے والوں کے لیے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ (ان کی خواہشات کے مطابق) ٹیڑھا ہو جائے۔ یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

پھر اسی بات کو ایک دوسرے پیرائے میں یوں بیان کیا گیا ہے :-

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۔ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا - (۱۷ : ۱۹)

جو کوئی عاجلہ کا خواہشمند ہو، اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اُس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اُس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور وہ ہو مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

حضور سرورِ دو عالم اور آپ کے جلیل القدر صحابہ اس دنیا اور اس کے فوائد و لذائذ کے بارے میں جو احساسات رکھتے ہیں ان کو مندرجہ ذیل واقعات سے اچھی طرح معلوم کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمرو بن عوف انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو جزیہ لینے کے لیے بحرین بھیجا، وہ بحرین سے مال لے کر آئے، انصار نے سنا کہ حضرت ابو عبیدہ آ گئے، تو انہوں نے نمازِ فجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی - جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ سامنے آئے، آپ اُن کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، میرا خیال ہے کہ تم نے سن لیا، ابو عبیدہ بحرین سے کچھ لائے ہیں ۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا :-

ابشروا وأملوا ما يسركم فوالله ما الفقر أخشى عليكم ولكني أخشى أن تبسط الدنيا عليكم كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما أهلكتهم (متفق علیہ)

مبارک ہو اور خوشی کی امید رکھو خدا کی قسم میں تمہارے لیے فقر سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہارے لیے بھی دنیا اُس طرح نہ پھیلا دی جائے جیسے تم سے پہلی امتوں کے لیے پھیلائی گئی تھی تو جیسے ان کو ہلاک کیا کہیں تم کو بھی ہلاک نہ کر دے۔

حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے اور ہم سب آپ کے گرد بیٹھے تھے آپ نے ارشاد فرمایا :-

ان مما اخاف علیکم بعدی ما یفتح علیکم من زھرۃ الدنیا و زینتھا (متفق علیہ)	مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں میرے بعد تم پر دنیا کی آرائش اور اُس کی زینت کھول نہ دی جائے ۔
وعن کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (ترمذی)	حضرت کعب بن عیاض سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے ۔

اس زندگی کو بے حقیقت اور فانی اور موت کے بعد کی زندگی کو ابدی اور جاودانی سمجھنے کا نتیجہ یہ تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ ہمیشہ اس مادی دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش رہتے تھے۔ وہ دنیاوی متاع پر ہر قسم کی دسترس رکھنے کے باوجود ایسی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے جس کی مثال تارک الدنیا راہب اور صحرانشین زاہد بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اُن کے دلوں میں کبھی یہ خیال تک بھی نہ آتا کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُر راحت اور پُرآسائش بنانے کی کوشش کریں۔ اُن کی ساری دلچسپیاں صرف آخرت کو سنوارنے میں صرف ہوتیں۔ اقامتِ دین کا کام ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اس کام میں اُن کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ دنیا کے ہر انہماک کو اس پر رشک آتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بیشتر صحابہ نے اپنی مقدس زندگیوں کو انتہائی فقر و فاقہ میں بسر کیا۔ حضور سرورِ کائنات نے اس فقر کو اپنی محبت کی ایک بڑی علامت بنایا ہے:۔

حضرت عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا "دیکھو کیا کہتے ہو"۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں آپ سے محبت کرتا ہوں (تین مرتبہ اسے دہرایا) آپ نے ارشاد فرمایا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو فقر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بیشک جو مجھ سے محبت کرتا ہے فقر اس کے پاس سیلاب سے بھی زیادہ تیز پہنچتا ہے ۔

حضور کی اپنی زندگی جس عسرت سے گذری اُس کے نقوش تاریخ کی لوح پر ابھی تک محفوظ ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ہم یہاں صرف چند واقعات نقل کرتے ہیں جن سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور اس زندگی کو فی الحقیقت کیا حیثیت دیتے تھے۔

ایک بار حضرت عمرؓ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ آپ چٹائی پر بیٹھے ہوئے ہیں جس پر کوئی بستر نہیں ہے، جسم مبارک پر تہبند کے سوا کچھ نہیں، پہلوؤں پر نشان پڑ گئے ہیں۔ توشہ خانہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی مٹھی بھر جو کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے، ارشاد ہوا کہ عمرؓ کیوں رونے ہو؟ بولے کیوں نہ روؤں، آپ کی یہ حالت ہے اور قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے اُڑا رہے ہیں۔" فرمایا کیا تمہیں پسند نہیں کہ ہمارے لیے آخرت اور اُن کے لیے دنیا ہو"

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جائدادیں نہ بناؤ، تم کو دنیا کی رغبت ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے اور ہم اپنے ایک چھپر کی مرمت کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "میں دیکھتا ہوں کہ موت اس سے بھی زیادہ قریب ہے"

حضور نے جس انداز سے زندگی بسر کی اُس کے متعلق اُن کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت یہ ہے کہ آنحضرت کے گھر والے دو دن متواتر جو کی روٹی سے سیر نہ ہوسکے حتیٰ کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

جب مخدومِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہونے لگے اس وقت کاشانۂ نبوت کی ساری دولت صرف سات دینار تھی۔ اُن کے بارے میں بھی حضرت عائشہ سے فرمایا: انہیں غریبوں میں تقسیم کر دو۔ مجھے شرم آتی ہے کہ رسول اپنے اللہ سے ملے اور اس کے گھر میں دولتِ دنیا پڑی ہو۔ اس ارشاد کی تعمیل کے بعد گھر کی حالت یہ ہو گئی کہ دونوں جہاں کا سردار دنیا سے رخصت ہو رہا ہے اور گھر

میں چراغ جلانے کے لیے تیل تک موجود نہیں۔ چنانچہ روشنی کرنے کے لیے تیل ایک پڑوسی عورت سے ادھار لینا پڑا۔

حضور سرورِ دوعالمؐ کے وصال کے بعد آپ کے رفقائے کار رضی اللہ عنہم نے ایک لمبی مدت تک اسی انداز زیست کی نہایت سختی سے پیروی کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دن پینے کا پانی مانگا تو لوگ شہد کا شربت لے آئے۔ پیالے کو منہ سے لگا کر ہٹا لیا اور رونے لگے جو لوگ پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی رو پڑے تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے، پھر دوبارہ رونا شروع کیا۔ لوگوں نے پوچھا آخر آپ کیوں روئے۔ فرمایا میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کسی آدمی کو دھکیل رہے ہیں حالانکہ کوئی شخص آپ کے پاس نہ تھا، میں نے عرض کی یہ آپ کس کو دھکیل رہے ہیں۔ فرمایا دنیا میرے سامنے مجسم ہو کر آئی تھی، میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ وہ ہٹ گئی مگر دوبارہ آئی اور کہا کہ آپ مجھ سے بچ کے نکل جائیں گے تو نکل جائیں لیکن آپ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے، مجھے یہی واقعہ یاد آگیا اور میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ وہ کہیں مجھ سے چمٹ نہ جائے۔

رسولِ امین کے اس یار غار نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے ارشاد فرمایا "بیت المال سے وظیفہ کا حساب کیا جائے جو میں نے آج تک وصول کیا ہے۔ جب اس حکم کی تعمیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ رقم کل چھ ہزار درہم یا ۱۵ سو روپے بنتی ہے۔ صدیق اکبرؓ نے حکم صادر فرمایا کہ میری زمین فروخت کر کے یہ رقم ادا کر دی جائے۔ اُسی وقت زمین فروخت کی گئی اور انہیں بیت المال کے بار سے بالکل سبکدوش کر دیا گیا۔ آپ کے خلافت قبول کرنے کے بعد آپ کے مال میں جو اضافہ ہوا تھا اس میں ایک حبشی غلام، ایک چادر اور ایک اونٹنی تھی۔ ان کے متعلق ہدایت کی کہ میری وفات کے بعد یہ تینوں چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔ رحلتِ مبارک کے بعد جب یہ سامان خلیفۂ ثانیؓ کے سامنے آیا تو آپ بے اختیار رو پڑے اور کہا: اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر گئے ہو۔

آپ نے وفات کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ عرض کیا تین کپڑوں میں۔ ارشاد فرمایا: میرے کفن میں بھی تین

کپڑے ہوں۔ یہ دو چادریں جو میرے بدن پر ہیں، دھولی جائیں اور ایک کپڑا اپنا لیا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے دردمندانہ کہا: ابا جان! ہم اس قدر غریب نہیں ہیں کہ نیا کفن بھی نہ خرید سکیں۔ ارشاد فرمایا: بیٹی! نئے کپڑوں کی مُردوں کی بہ نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لیے یہی پھٹا پرانا ٹھیک ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زہد کے واقعات سے کون شخص ناواقف ہے۔ اگر کوئی پر تکلف کھانے کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں قیامت میں مجھ سے یہ نہ کہا جائے کہ اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا (تم اپنے سارے مزے دنیا میں اڑا چکے ہو اور اُن کا لُطف اٹھا چکے ہو) کوئی اگر لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سارے مسلمان یہ کھاتے ہیں۔ نفی میں جواب ملنے پر اس کو ہاتھ نہ لگاتے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہؓ دونوں نے مل کر کہا: امیر المومنین! خدا نے آپ کو مرتبہ دیا ہے۔ شہنشاہوں کے سفیر آپ کے پاس آتے ہیں، اب آپ کو اپنی معاشرت بدل دینی چاہیے۔" فرمایا" افسوس ہے تم دونوں رسول اللہ کی ازواج ہو کر مجھے دنیا طلبی کی ترغیب دے رہی ہو؟ اے عائشہؓ! تم رسولؐ کی حالت کو بھول گئیں جبکہ گھر میں صرف ایک ہی کپڑا ہوتا تھا۔ اسی کو آپ دن کے وقت بچھاتے تھے اور اسی کو رات اوڑھتے تھے۔ اے حفصہؓ! کیا تمہیں یاد نہیں جب ایک رات تم نے رسول اللہ کے بستر کو دوہرا کر کے بچھایا تو آپ رات بھر سوتے رہے۔ پھر صبح اٹھتے ہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا" حفصہؓ! یہ تم نے کیا کیا کہ میرے بستر کو دوہرا کردیا اور میں صبح تک سوتا رہا۔ مجھے دنیاوی آسائشوں سے کیا تعلق ہے؟ تم نے فرش نرم کر کے مجھے کیوں غافل کر دیا؟"

بیت المقدس کا شاہانہ اور فاتحانہ سفر جس شان سے فرمایا وہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، سواری میں ایک اونٹ، سر کھلا ہوا، پاؤں کے لیے رکاب بھی نہیں، جو اونٹ کا کمبل وہی سونے کا بستر، سامان کی جو خرجی وہی سر کا تکیہ، بدن پر گزی کا کرتہ جو پہلو سے پھٹا ہوا۔ اس شان سے وہ سفر کر رہا ہے جو روئے زمین کا سب سے طاقتور حکمران ہے۔

حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے ایک رفیق ضرار بن حمزہ سے کہا کہ علیؓ کا حال بیان کرو۔ انہوں نے معذرت کی۔ لیکن جب حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا تو انہوں نے جو کچھ بیان کیا اُس سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فدائی اس زندگی کے بارے میں کیا طرزِ عمل رکھتے تھے۔ ضرار نے کہا:

"ان کو دنیا اور اس کی بہار اور رونق سے وحشت ہوتی تھی، اور رات اور اس کی تاریکی میں دل بہلتا تھا، آنکھیں پُر اشک رہا کرتی تھیں، ایک ملے فکر اور سوچ میں رہا کرتے، لباس وہ پسند آتا جو موٹا ہو، کھانا وہ دل کو بھاتا جو معمولی اور سادہ ہوتا۔ بالکل معمولی آدمی کی طرح رہتے۔ ہم میں اور ان میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا، جب ہم کچھ پوچھتے تو جواب دیتے۔ جب ہم آتے تو وہ سلام میں پہل کرتے، جب ہم بلاتے تو وہ بے تکلف آجاتے لیکن ان کے یہاں اس تقرب اور ہمارے اس قرب کے باوجود رعب اتنا تھا کہ ہم گفتگو نہ کرسکتے، اور خود چھیڑ کر بات نہ کرسکتے، دینداروں کی تعظیم کرتے تھے اور مسکینوں سے محبت رکھتے تھے، طاقتور کو ان سے کسی چیز کی امید نہ ہوتی، اور کمزور ان کے انصاف سے ناامید نہ ہوتا، خدا میں نے انہیں بعض مواقع پر اس وقت دیکھا ہے کہ رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے اور تارے ڈھل گئے تھے، وہ اپنی محراب میں کھڑے تھے، ڈاڑھی پکڑے ہوئے مارگزیدہ کی طرح تڑپتے تھے، اور اس طرح روتے تھے کہ جیسے دل پر چوٹ لگی ہو گویا کہ میں سن رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں، اے دنیا! کیا مجھ سے چھیڑ کرنے چلی ہے، اور مجھ پر تیری نظر ہے، اس کی امید نہ کرنا، کسی اور کو فریب دے، میں نے تجھ کو ایسا چھوڑا ہے کہ کبھی تیرا نام بھی نہ لونگا، تیری عمر مختصر، تیری زندگی بے وقعت اور تیرا خطرہ بہت ہے، ہائے سامانِ سفر کس قدر کم ہے، سفر کتنے دور کا ہے۔ راستہ کتنا وحشتناک ہے۔"

یہ ہے اُس طرزِ عمل کا صحیح نقشہ جو ایک مسلمان اس عارضی زندگی کے بارے میں اختیار کر کے پیش کرتا ہے۔ آج جبکہ مغربی استیلا نے ہمارے فکر و نظر کے زاویوں کو یکسر بدل دیا ہے اور ہم

دنیاوی فوائد و لذائذ کے حصول کے لیے مجنونانہ جدوجہد کو عین ترقی سمجھ بیٹھے ہیں ہمیں حیات انسانی کی یہ تصویر بلاشبہ ہمیں کچھ عجیب و غریب سی معلوم ہوتی ہے اور ہم بدقسمتی سے اپنے آپ کو اس سے اتنا ہی دور پاتے ہیں جتنا کہ کوئی دنیا پرست۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جانثاروں نے اسی قسم کے اندازِ زیست کو پسند فرمایا اور اسے ہی امتِ مسلمہ کے افراد کو اختیار کرنے کی تلقین کی۔ سرورِ دو عالم نے زر و مال کے فتنہ کی تباہ کاریوں کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جائیں اور ان کا ستیاناس کریں تو وہ اتنے خطرناک نہیں جتنی آدمی کے دین کے لیے دولت و عزت کی حرص خطرناک ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس فتنۂ دنیا سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے اپنے رب سے بڑی ہی دلسوزی سے یوں التجا کیا کرتے تھے۔

لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا	اور دنیا کو نہ ہمارا مقصودِ اعظم بنا، اور نہ ہی ہمارے معلومات کی انتہا اور نہ ہی ہماری رغبت کی منزلِ مقصود اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر نامہربان ہو۔

اس چند روزہ زندگی کے بارے میں جب کوئی شخص یہ طرزِ فکر اختیار کرتا ہے تو اس سے نہ صرف اُس کی نظر میں آخرت کے مقابلہ میں دنیا بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ خدا کی عظمت اور کبریائی کے سامنے اُسے اپنی ناتوانی و بے نوائی، فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ پھر اپنے آپ کو اس کائنات کا مرکز نہیں سمجھتا بلکہ ہمیشہ ایک فقیرِ بے نوا کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنے افعال و اعمال پہ اترانے کی بجائے خدا کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار رہتا ہے۔ اس کائنات کے اندر آخر حضور سرورِ دو عالم سے زیادہ کون سی ذات زیادہ پاک اور مقدس ہو سکتی ہے مگر دیکھیے کہ حضور بھی اُس کائنات کے خالق کے سامنے اپنی بے بسی کا کس طرح سے اظہار فرماتے ہیں۔

اللھم الیک اشکو ضعف قوتی	الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر

وقلة حيلتي وهواني على الناس رب المستضعفين الى من تكلني الى بعيد يتجهمني او الى عدو ملكته امري ان لم يكن بك علي غضب فلا ابالي غير ان عافيتك هي اوسع لي - اعوذ بنور وجهك الذي اشرقت له الظلمات وصلح عليه امر الدنيا والآخرة من ان يحل بي غضبك او ينزل علي سخطك لك العتبى حتى ترضى ولا حول ولا قوة الا بك۔

کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے کیا بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا اور دین کے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔

پھر انہیں جذبات کا اظہار دوسرے مقام پر اس طرح کیا گیا ہے:

اللهم انك تسمع كلامي وترى مكاني وتعلم سري وعلانيتي لا يخفى عليك شيء من امري وانا البائس الفقير المستغيث المستجير الوجل المشفق المقر المعترف بذنبه - اسالك مسئلة المسكين و ابتهل اليك ابتهال المذنب الذليل وادعوك دعاء الخائف الضرير، دعاء من

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں۔ فریادی ہوں۔ پناہ جو ہوں۔ پریشان ہوں۔ ہراساں ہوں۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں۔ تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے

خضعت لك رقبته فاضت لك عبرته و ذل لك جسمه ورغم لك انفه ۔ اللّٰهم لا تجعلني بدعائك شقيا وكن بي رؤفا رحيما يا خير المسئولين ويا خير المعطين ۔

گنہگار عاجز گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہے جیسے خوف زدہ، آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہو جا اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر، اے سب دینے والوں سے اچھے ۔

ایک دوسری جگہ اس احساس نے مندرجہ ذیل الفاظ کی شکل اختیار کی ہے :۔

اللّٰهم انی عبدك وابن عبدك وابن امتك ناصيتي بيدك ماضٍ فيّ حكمك عدل فيّ قضاءك

اے اللہ میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں تیرے بندے کا اور بیٹا ہوں تیری بندی کا۔ ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں۔ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا حکم اور عین عدل ہے میرے بارے میں تیرا فیصلہ ۔

ان وارداتِ قلبی پر بار بار غور کریں اور دیکھیں کہ یہ کس بزرگ و برتر ذات کی دلی کیفیات کی ترجمانی ہے۔ وہ ذات جو سوائے خدا کے دنیا کی ہر شے سے ارفع و اعلیٰ ہے وہ اپنے مولا کے حضور میں کس طرح سے سر نیاز خم کرتی ہے، وہ مالک الملک کے حضور میں کس انداز سے اپنی بیچارگی اور بے بسی کا اعتراف کرتی ہے کیا وہ دل جو اس قسم کے جذبات کا مبدا ہو، اس میں کبھی بھی غرور و تکبر راہ پا سکتے ہیں؟ یہ انہیں احساسات کا نتیجہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقاء کار اخلاق و فضائل کے اوج کمال تک پہنچنے کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو کمزور اور ناتواں سمجھتے رہے۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے جن سے ان پاکباز اور مقدس انسانوں کی تواضع اور انکساری

کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

حضرت ابوبکر صدیق ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے درخت کے سایہ میں ایک چڑیا کو اچھلتے اور پھدکتے دیکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس سے فرمایا "اے چڑیا تو کس قدر خوش نصیب ہے درختوں کے پھل کھاتی ہے اور ٹھنڈی چھاؤں میں خوش رہتی ہے۔ پھر موت کے بعد تو وہاں جائے گی جہاں تجھ سے باز پرس نہ ہوگی۔ اے کاش! ابوبکر بھی اس قدر خوش نصیب ہوتا"۔ آپ کبھی یہ فرماتے اے کاش! میں درخت ہوتا، کھالیا جاتا یا کاٹ دیا جاتا۔ کبھی کہتے! اے کاش! میں سبزہ ہوتا اور چارپائے مجھے چر لیتے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی نے آپ کے سامنے اُن اعمالِ حسنہ کا ذکر کر دیا جو آپ نے رسول اللہ کے ساتھ مل کر انجام دیئے تھے۔ حضرت عمر بے قرار ہو گئے اور ارشاد فرمایا "مجھے اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تو اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ اگر اجر نہ ملے تو عذاب ہی سے بچ جاؤں"

ایک دفعہ راستہ پر سے گذر رہے تھے کہ کچھ خیال آیا۔ وہیں آپ زمین کی طرف جھکے اور ایک تنکا اٹھالیا۔ پھر ارشاد فرمایا "اے کاش! میں اس تنکے کی طرح خس و خاشاک ہوتا۔ اے کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ اے کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی"۔ ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا: اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک آدمی کے سوا دنیا کے تمام لوگ بخش دیئے گئے ہیں تب بھی میرا خوف زائل نہ ہوگا۔ میں سمجھونگا۔ شاید وہ ایک بدقسمت انسان میں ہی ہوں۔

ایک دفعہ ممبر پر چڑھ کر فرمایا کہ ایک دن وہ تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور وہ اس کے عوض میں مٹھی بھر کھجوریں دے دیا کرتی تھیں۔ آج یہ زمانہ ہے کہ میں امیر المومنین ہوں۔ یہ کہکر ممبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: یہ تو آپ نے اپنی تنقیص کی" بولے تنہائی میں میرے دل نے کہا کہ تم امیر المومنینؓ ہو، تم سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اپنی حقیقت بیان کر دوں۔

ایک مرتبہ صدقہ کے اونٹوں کے سخت گرمی میں نار کول لگا رہے تھے، کسی شخص نے کہا کسی غلام

سے فرما دیا ہوتا۔ فرمایا مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوگا۔

حیاتِ انسانی کے متعلق ان تصورات و افکار اور احساسات و جذبات سے سیرت و کردار کا جو خمیر اٹھایا جاتا ہے وہ ایک طرف تو نسلی اور نسبی تفوق کی ہر آلائش سے پاک ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جو فرد بھی اس خمیر سے اپنے اخلاق کو غذا بہم پہنچاتا ہے اُس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دکھ درد کے لیے لرزتے ہیں اور انسانوں کی معمولی مصیبت کو دیکھ کر اُن میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انسانوں کے "ریوڑ" میں فوق البشر نہیں سمجھتا بلکہ انہیں کی طرح ایک معمولی انسان خیال کرتا ہے۔ اُسے کبھی اس بات کا اندیشہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُس کا دامنِ تقدس، عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا بلکہ وہ ہمیشہ اس آرزو میں ہمت آزما رہتا ہے کہ وہ غریب عوام کے ساتھ مل کر ان کی ذہنی، اخلاقی اور دینی سطح بلند کرے۔ وہ محض گلیمِ خویش کو بچا کر لے جانے کی فکر نہیں کرتا بلکہ دوسرے ڈوبنے والوں کو نکالنے کے لیے بھی مؤثر تدابیر اختیار کرتا ہے۔

پھر اس کے اندر ایک ایسا جوہر نایاب ترقی کرتا ہے، جسے لوگ انسانیت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ابنائے جنس میں محتسب بنا کر نہیں رکھتا بلکہ اُن میں بھائیوں کے رکھوالے کی حیثیت سے رہتا ہے۔ وہ بنی نوعِ انسان کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچتا ہے اور ایک اہلِ دل انسان کی طرح اُن کی وجہ اور علت معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اُسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ وہ اُن اسباب کا کھوج لگائے جنہوں نے اُس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ وہ جب اپنے سامنے ایک بدبخت مجرم کو دیکھتا ہے تو اُس میں نخوت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس وقت بھی اُسے یہ خیال گزرتا ہے کہ اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتی تو کیا عجب کہ آج وہ بھی اسی حالت میں ہوتا۔ اس لیے اُس کے دل میں مجرم کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنی

اس نیک اور پاکبازانہ زندگی پر اترانا نہیں بلکہ اس قادرِ مطلق کا شکر بجالانا ہے جس کی رحمت سے وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ اس قسم کے سیرت و کردار رکھنے والا شخص اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں۔ اُس کی صالح فطرت کسی جرم اور گناہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرتی۔ البتہ وہ جو کچھ کرتا ہے وہ صرف یہ کہ جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں ایک خطِ امتیاز کھینچ لیتا ہے۔ ایک با اخلاق آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ جرم کے تدارک کی فکر کرتا ہے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی سختی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ لیکن بحیثیت ایک انسان کے اُسے مجرموں کے ساتھ ایک فطری ہمدردی ہوتی ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنے ایک خط میں اس حقیقت کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"نضیر نام ایک شخص تھا۔ پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضور شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپ نے علیؓ مرتضیٰ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اُس کمبخت کا خاتمہ کر دیا۔ اُس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نضیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو حضورؐ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے۔ پھر حکم دیا کہ نضیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔"

غرض اس طرح مسلمِ حنیف قہر و محبت کے متصادم جذبات کو اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے۔

تفہیم القرآن

الشعراء

(۳)

اور انہیں ابراہیمؑ کا قصہ سناؤ[۱] جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ "یہ کیا

---

[۱] یہاں حضرت ابراہیمؑ کی حیاتِ طیبہ کے اس دور کا قصہ بیان ہوا ہے جبکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کشمکش شروع ہوئی تھی۔ اس دور کی تاریخ کے مختلف گوشے قرآن مجید میں حسب ذیل مقامات پر بیان ہوئے ہیں: البقرہ رکوع ۳۵۔ الانعام رکوع ۹۔ مریم رکوع ۳۔ الانبیاء رکوع ۵۔ الصّٰفّٰت رکوع ۳۔ الممتحنہ رکوع ۱۔

سیرت ابراہیمی کے اس دور کی تاریخ خاص طور پر جس وجہ سے قرآن مجید بار بار سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ بالعموم اور قریش بالخصوص اپنے آپ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے اور کہتے تھے اور یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ ملتِ ابراہیمی ہی ان کا مذہب ہے۔ مشرکینِ عرب کے علاوہ نصاریٰ اور یہود کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم ان کے دین کے پیشوا ہیں۔ اس پر قرآن مجید جگہ جگہ ان لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جو دین لیکر آئے تھے وہ یہی خالص اسلام تھا جسے نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس سے آج تم لوگ برسرِ پیکار ہو۔ وہ مشرک نہ تھے بلکہ ان کی ساری لڑائی شرک ہی کے خلاف تھی اور اسی لڑائی کی بدولت انہیں اپنے باپ، خاندان، قوم، وطن سب کو چھوڑ کر شام و فلسطین اور حجاز میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح وہ یہودی و نصرانی بھی نہ تھے بلکہ یہودیت و نصرانیت تو ان کے صدیوں بعد وجود میں آئیں۔ اس تاریخی استدلال کا کوئی جواب نہ مشرکین کے پاس تھا، نہ یہود و نصاریٰ کے پاس، کیونکہ مشرکین کو بھی یہ تسلیم تھا کہ عرب میں بتوں کی پرستش حضرت ابراہیم کے کئی صدی بعد شروع ہوئی تھی، اور یہود و نصاریٰ بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جن مخصوص عقائد اور اعمال پر یہ لوگ اپنے دین کا

چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟"[۲] انہوں نے جواب دیا "کچھ بُت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں[۳]"۔ اس نے پوچھا "کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے[۴]"۔ اس پر ابراہیم نے کہا "کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور

مدار رکھتے ہیں وہ اس دینِ قدیم کے اجزاء نہیں ہیں جو ابتدا سے چلا آ رہا تھا، اور صحیح دین وہی ہے جو ان آمیزشوں سے پاک ہو کر خالص خدا پرستی پر مبنی ہو۔ اسی بنیاد پر قرآن کہتا ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَ	ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یک سُو
لٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ	تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہ تھا۔ درحقیقت
إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَ	ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق انہی لوگوں
هٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ (آل عمران رکوع ۷)	کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کے طریقے کی پیروی کی،
	(اور اب یہ حق) اس نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں
	(کو پہنچتا ہے)۔

[۲] حضرت ابراہیمؑ کے اس سوال کا مدعا یہ معلوم کرنا نہ تھا کہ وہ کن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ ان بتوں کو تو وہ خود بھی دیکھ رہے تھے جن کی پرستش وہاں ہوتی تھی۔ ان کا مدعا دراصل ان لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ ان معبودوں کی حقیقت کیا ہے جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اسی سوال کو سورۂ انبیاء میں بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے: مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ "یہ کیسی صورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟"

[۳] یہ جواب بھی محض یہ خبر دینے کے لیے نہ تھا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں، کیونکہ سائل و مسئول دونوں کے سامنے یہ امر واقعہ عیاں تھا۔ اس جواب کی اصل روح اپنے عقیدے پر ان کا ثبات اور اطمینان تھا۔ گویا دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہاں، ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بُت ہیں جن کی ہم پوجا کر رہے ہیں، مگر ہمارا دین و ایمان یہی ہے کہ ہم ان کی پرستش اور خدمت میں لگے رہیں۔

[۴] یعنی ہماری اس عبادت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ہماری مناجاتیں اور دعائیں اور فریادیں سنتے ہیں یا

تمہارے باپ دادا بجالاتے رہے ہیں؟[۵] میرے تو یہ سب دشمن ہیں،[۶] بجز ایک رب العالمین کے،[۷] جس نے

ہمیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں اس لیے ہم نے ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے، بلکہ اصل وجہ اس عبادت کی یہ ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس طرح انھوں نے خود یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے مذہب کے لیے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آخر تم نئی بات ہمیں کیا بتانے چلے ہو؟ کیا ہم خود نہیں دیکھتے کہ یہ لکڑی اور پتھر کی مورتیں ہیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ لکڑیاں سنا نہیں کرتیں اور پتھر کسی کا کام بنانے یا بگاڑنے کے لیے نہیں اٹھا کرتے؟ مگر یہ ہمارے بزرگ جو صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ ان کی پوجا کرتے چلے آرہے ہیں تو کیا یہ سب تمہارے نزدیک بے وقوف تھے؟ ضرور کوئی وجہ ہوگی کہ وہ ان بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے رہے۔ لہٰذا ہم بھی ان کے اعتماد پر یہ کام کر رہے ہیں۔

۵ یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلا آرہا ہے؟ کیا نسل پر نسل بس یونہی آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجالا رہے ہیں ان کے اندر واقعی خدائی کی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟

۶ یعنی میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش کروں گا تو میری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت کو محض بے نفع اور بے ضرر ہی نہیں سمجھتا بلکہ الٹا نقصان دہ سمجھتا ہوں اس لیے میرے نزدیک تو ان کو پوجنا دشمن کو پوجنا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے اس قول میں اس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورہ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا "انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جبکہ وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور الٹے ان کے مخالف ہو جائیں گے"۔ یعنی قیامت کے روز وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، نہ ہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

یہاں حکمتِ تبلیغ کا بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں، بلکہ

مجھے پیدا کیا،[۵۸] پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے[۵۹] جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں امید

یہ فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کہتے کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے۔ بخلاف اس کے جب انہوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخاطب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور برے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ اس طریقہ سے حضرت ابراہیم نے گویا ہر انسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بنا پر وہ خود اپنا خیرخواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کبھی اپنا برا نہیں چاہتا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت میں سراسر اپنا نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ و دانستہ میں اپنی بدخواہی نہیں کر سکتا، لہٰذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں اس کے بعد مخاطب فطرۃً یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلائی کس چیز میں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بدخواہی کر رہا ہو۔

[۵۷] یعنی تمام ان معبودوں میں سے، جن کی دنیا میں بندگی و پرستش کی جاتی ہے، صرف ایک اللہ رب العلمین ہے جس کی بندگی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے، اور جس کی عبادت میرے نزدیک ایک دشمن کی نہیں بلکہ اپنے اصل مربّی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ چند فقروں میں وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر صرف اللہ رب العالمین ہی عبادت کا مستحق ہے، اور اس طرح اپنے مخاطبوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے پاس تو معبودانِ غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معقول وجہ بجز تقلیدِ آبائی کے نہیں ہے جسے تم بیان کر سکو گے، مگر میرے پاس صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کے لیے نہایت معقول وجوہ موجود ہیں جن سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔

[۵۸] یہ اولین وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ اور صرف ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ مخاطب بھی اس حقیقت کو جانتے اور مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے، اور انہیں یہ بھی تسلیم تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اپنے معبودوں کے بارے میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالق کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی پہلی دلیل یہ تھی کہ میں صرف اس کی عبادت کو صحیح و برحق سمجھتا ہوں

رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔" (اس کے بعد ابراہیمؑ نے دعا کی) "اے میرے رب،

جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ دوسری کوئی ہستی میری عبادت کی کیسے مستحق ہو سکتی ہے جبکہ میرے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ مخلوق کو اپنے خالق کی بندگی تو کرنی ہی چاہیے، لیکن غیر خالق کی بندگی وہ کیوں کرے؟

۵ یہ دوسری وجہ ہے اللہ اور اکیلے اللہ ہی کے مستحقِ عبادت ہونے کی۔ اگر اس نے انسان کو بس پیدا ہی کر کے چھوڑ دیا ہوتا اور آگے اس کی خبر گیری سے وہ بالکل بے تعلق رہتا، تب بھی کوئی معقول وجہ اس امر کی ہو سکتی تھی کہ انسان اس کے علاوہ کسی دوسری طرف بھی سہارے ڈھونڈنے کے لیے رجوع کرتا۔ لیکن اس نے تو پیدا کرنے کے ساتھ رہنمائی، پرورش، نگہداشت، حفاظت اور حاجت روائی کا ذمہ بھی خود ہی لے لیا ہے۔ جس لمحے انسان دنیا میں قدم رکھتا ہے اسی وقت ایک طرف اس کی ماں کے سینے میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کوئی ان دیکھی طاقت اسے دودھ چوسنے اور حلق سے اتارنے کا طریقہ سکھا دیتی ہے۔ پھر اس تربیت و رہنمائی کا سلسلہ اول روزِ پیدائش سے شروع ہو کر موت کی آخری ساعت تک برابر جاری رہتا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو اپنے وجود اور نشو و نما اور بقا و ارتقاء کے لیے جس جس نوعیت کے سرو سامان کی حاجت پیش آتی ہے وہ سب اس کے پیدا کرنے والے نے زمین سے لیکر آسمان تک ہر طرف مہیا کر دیا ہے۔ اس سرو سامان سے فائدہ اٹھانے اور کام لینے کے لیے جن جن طاقتوں اور قابلیتوں کی اس کو حاجت پیش آتی ہے وہ سب بھی اس کی ذات میں ودیعت کر دی ہیں، اور ہر شعبۂ حیات میں جس جس طرح کی رہنمائی اس کو درکار ہوتی ہے اس کا بھی پورا انتظام اس نے کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انسانی وجود کی حفاظت کے لیے اور اس کو آفات سے، بیماریوں سے، مہلک جراثیم سے اور زہریلے اثرات سے بچانے کے لیے خود اس کے جسم میں اتنے زبردست انتظامات کیے ہیں کہ انسان کا علم ابھی تک ان کا پورا احاطہ بھی نہیں کر سکا ہے۔ اگر یہ قدرتی انتظامات موجود نہ ہوتے تو ایک معمولی کانٹا چبھ جانا بھی انسان کے لیے مہلک ثابت ہوتا اور اپنے علاج کے لیے آدمی کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکتی۔ خالق کی یہ ہمہ گیر رحمت و ربوبیت جب ہر آن ہر پہلو سے انسان کی دست گیری کر رہی ہے تو اس سے بڑی حماقت و جہالت اور کیا ہو سکتی ہے، اور اس سے بڑھ کر احسان فراموشی بھی اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کے آگے سرِ نیاز جھکائے اور حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے کسی اور کا دامن تھامے۔

مجھے حکم عطا کر[11] اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا[12] اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر[13] اور

۱۰؎ یہ تیسری وجہ ہے جس کی بنا پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت درست نہیں ہو سکتی۔ انسان کا معاملہ اپنے خدا کے ساتھ صرف اِس دنیا اور اس کی زندگی تک محدود نہیں ہے کہ وجود کی سرحد میں قدم رکھنے سے شروع ہو کر موت کی آخری ہچکی پر وہ ختم ہو جائے، بلکہ اس کے بعد اُس کا انجام بھی سراسر خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی خدا جو اس کو وجود میں لایا ہے، آخرکار اسے اِس دنیا سے واپس بلا لیتا ہے اور کوئی طاقت دنیا میں ایسی نہیں ہے جو انسان کی اِس واپسی کو روک سکے۔ آج تک کسی دوا یا طبیب یا دیوی دیوتا کی مداخلت اُس ہاتھ کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے جو انسان کو یہاں سے نکال لے جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ بہت سے انسان بھی جنہیں معبود بنا کر انسانوں نے پوج ڈالا ہے، خود اپنی موت کو نہیں ٹال سکے ہیں۔ صرف خدا ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس شخص کو کب اِس جہان سے واپس طلب کرتا ہے، اور جس وقت جس کی طلبی بھی اس کے ہاں سے آجاتی ہے اسے چار و ناچار جانا ہی پڑتا ہے۔ پھر وہی خدا ہے جو اکیلا اس امر کا فیصلہ کریگا کہ کب ان تمام انسانوں کو جو دنیا میں پیدا ہوئے تھے دوبارہ وجود میں لائے اور ان سے ان کی حیاتِ دنیا کا محاسبہ کرے۔ اُس وقت بھی کسی کی یہ طاقت نہ ہو گی کہ بعث بعد الموت سے کسی کو بچا سکے یا خود بچ سکے۔ ہر ایک کو اس کے حکم پر اٹھنا ہی ہوگا اور اس کی عدالت میں حاضر ہونا پڑیگا۔ پھر وہی اکیلا خدا اس عدالت کا قاضی و حاکم ہو گا۔ کوئی دوسرا اس کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی شریک نہ ہو گا۔ سزا دینا یا معاف کرنا بالکل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہو گا۔ کسی کی یہ طاقت نہ ہو گی کہ جسے وہ سزا دینا چاہے اس کو بخشوا لے جائے، یا جسے وہ بخشنا چاہے اسے سزا دلوا سکے۔ دنیا میں جن کو بخشوا لینے کا مختار سمجھا جاتا ہے وہ خود اپنی بخشش کے لیے بھی اسی کے فضل و کرم کی آس لگائے بیٹھے ہونگے۔ اِن حقائق کی موجودگی میں جو شخص خدا کے سوا کسی کی بندگی کرتا ہے وہ اپنی بدانجامی کا خود سامان کرتا ہے۔ دنیا سے لیکر آخرت تک آدمی کی ساری قسمت تو ہو خدا کے اختیار میں، اور اسی قسمت کے بناؤ کی خاطر آدمی رجوع کرے اُن کی طرف جن کے اختیار میں کچھ نہیں ہے، اس سے بڑھ کر شامتِ اعمال اور کیا ہو سکتی ہے۔

۱۱؎ "حکم" سے مراد یہاں "نبوت" لینا درست نہ ہو گا، کیونکہ جس وقت کی یہ دعا ہے اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ دعا اس سے پہلے کی بھی ہو تو نبوت کسی کی طلب پر

مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا[۱۴]

اسے عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ ایک وہبی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے یہاں حکم سے مراد علم، حکمت، فہم صحیح اور قوتِ فیصلہ ہی لینا درست ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا قریب قریب اسی معنی میں ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے کہ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَاھِیَ، یعنی ہم کو اس قابل بنا کہ ہم ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھیں جیسی کہ وہ فی الواقع ہے اور ہر معاملہ میں وہی رائے قائم کریں جیسی کہ اس کی حقیقت کے لحاظ سے قائم کی جانی چاہیے۔

[۱۲] یعنی دنیا میں مجھے صالح سوسائٹی دے اور آخرت میں میرا حشر صالحوں کے ساتھ کر۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، صالح لوگوں کے ساتھ کسی کا حشر ہونا اور اس کا نجات پانا گویا ہم معنی ہیں، اس لیے یہ تو ہر اس انسان کی دعا ہونی ہی چاہیے جو حیات بعد الموت اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن دنیا میں بھی ایک پاکیزہ روح کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بداخلاق فاسق و فاجر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی مصیبت سے نجات دے اور اس کو نیک لوگوں کے ساتھ ملائے۔ معاشرے کا بگاڑ جہاں چاروں طرف محیط ہو وہاں ایک آدمی کے لیے صرف یہی چیز ہمہ وقت اذیت کی موجب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش گندگی ہی گندگی پھیلی ہوئی دیکھتا ہے، بلکہ اس کے لیے خود پاکیزہ رہنا اور اپنے آپ کو گندگی کے چھینٹوں سے بچا کر رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک صالح آدمی اس وقت تک بے چین ہی رہتا ہے جب تک یا تو اس کا اپنا معاشرہ پاکیزہ نہ ہو جائے، یا پھر اس سے نکل کر وہ کوئی دوسری ایسی سوسائٹی نہ پا لے جو حق و صداقت کے اصولوں پر چلنے والی ہو۔

[۱۳] یعنی بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں۔ میں دنیا سے وہ کام کر کے نہ جاؤں کہ نسلِ انسانی میرے بعد میرا شمار ان ظالموں میں کرے جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دنیا کو بگاڑ کر چلے گئے، بلکہ مجھ سے وہ کارنامے انجام پائیں جن کی بدولت رہتی دنیا تک میری زندگی خلقِ خدا کے لیے ایک روشنی کا مینار بنی رہے اور مجھے انسانیت کے محسنوں میں شمار کیا جائے۔ یہ محض شہرت و ناموری کی دعا نہیں ہے بلکہ سچی شہرت اور حقیقی ناموری کی دعا ہے جو لازماً ٹھوس خدمات اور بیش قیمت کارناموں ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے، اور کسی شخص کو اس چیز کا حاصل ہونا اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے۔ دنیا میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی نسلوں کو بری مثالوں کے مقابلے میں ایک نیک مثال ملتی ہے جس سے وہ بھلائی کا سبق حاصل کرتی ہیں اور ہر سعید روح کو راہِ راست پر چلنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی چھوڑی ہوئی نیک مثال سے قیامت تک جتنے لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہوئی ہو ان کا ثواب اس شخص کو بھی ملیگا اور قیامت کے روز اس کے اپنے اعمال کے ساتھ کروڑوں

اور مجھے اُس دن رُسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے[۱۵] جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دیگا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو"[۱۶]

بندگانِ خدا کی یہ گواہی بھی اس کے حق میں موجود ہوگی کہ وہ دنیا میں بھلائی کے چشمے رواں کر کے آیا ہے جن سے نسل پر نسل برابر فیض یاب ہوتی رہی ہے۔

[۱۴] بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم کی اس دعائے مغفرت کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ مغفرت بہر حال اسلام کے ساتھ مشروط ہے اس لیے آنحضرت کا اپنے والد کی مغفرت کے لیے دعا کرنا گویا اس بات کی دعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن قرآن مجید میں اس کے متعلق مختلف مقامات پر جو تصریحات ملتی ہیں وہ اس توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم اپنے والد کے ظلم سے تنگ آکر جب گھر سے نکلنے لگے تو انہوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (مریم رکوع ۳) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے" اسی وعدے کی بنا پر انہوں نے یہ دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لیے کی بلکہ ایک دوسرے مقام پر بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے کی رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ (ابراہیم، رکوع ۶) لیکن بعد میں انہیں خود یہ احساس ہو گیا کہ ایک دشمنِ حق، چاہے وہ ایک مومن کا باپ ہی کیوں نہ ہو، دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (التوبہ۔ رکوع ۱۴) "ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا۔ مگر جب یہ بات کھل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اظہار بیزاری کر دیا"۔

[۱۵] یعنی قیامت کے روز یہ رسوائی مجھے نہ دکھا کہ میدانِ حشر میں تمام اولین و آخرین کے سامنے ابراہیم کا باپ سزا پا رہا ہو اور ابراہیم کھڑا دیکھ رہا ہو۔

[۱۶] یعنی اس روز آدمی کے کام اگر کوئی چیز آسکتی ہے تو وہ مال اور اولاد نہیں بلکہ صرف قلبِ سلیم ہے، ایسا دل جو کفر و شرک و نافرمانی اور فسق و فجور سے پاک ہو۔ مال اور اولاد بھی قلبِ سلیم کے ساتھ نافع ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔ مال صرف اس صورت میں وہاں مفید ہوگا جبکہ آدمی نے دنیا میں ایمان و اخلاص کے ساتھ اسے اللہ کی راہ میں صرف کیا ہو، ورنہ کروڑپتی اور ارب پتی آدمی بھی وہاں کنگال ہوگا۔ اولاد بھی صرف اسی حالت میں وہاں کام آسکے گی جبکہ آدمی نے دنیا میں اسے اپنی حد تک ایمان و حسنِ عمل کی تعلیم دی ہو، ورنہ بیٹا اگر نبی بھی ہو تو وہ باپ سزا پانے سے نہیں بچ سکتا جس کا اپنا خاتمہ کفر و معصیت پر ہوا ہو اور اولاد کی نیکی میں جس کا اپنا کوئی حصہ نہ ہو۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء[1]

عبدالحمید صدیقی

جن کتابوں نے جدید یورپین کلچر کی تشکیل و تعمیر میں سب سے اہم حصّہ لیا ہے ان میں ایک تو کوپرنکس (COPERICUS) کی کتاب (DE REVOLUTIONS ORBIUM) ہے جو ۱۵۴۳ء میں شائع ہوئی دوسری چارلس ڈارون (CHARLES DARWIN) کی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) جو ۱۸۵۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ کوپرنکس کی کتاب میں کائنات کے وجود کے بارے میں جو مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اُن کی تاریخِ جدید اس طرز پر مرتب کی گئی ہے کہ خدا پر یقین و ایمان خود بخود متزلزل ہو جاتا ہے۔ ڈارون کی کتاب اصل الانواع میں اگرچہ ہمیں ارتقاء کے متعلق بحث ملتی ہے لیکن اسے اس نہج پر اٹھایا گیا ہے کہ خالقِ کائنات اپنی اس کائنات سے خود بخود مستعفی ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک انسان جب سرسری طور پر ان کتب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان میں حیرت انگیز جدت اور "نیا پن" محسوس کرتا ہے لیکن وہ شخص جو اسی طرز کے دوسرے لٹریچر پر بھی نگاہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ ان حضرات کو جو ہمارے اس عہد میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے خیالات و افکار میں اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں زیادہ صحت ہے یا ان میں کسی قسم کی کوئی لغزش نہیں پائی جاتی۔ انہیں جو ہمارے اس عہد میں قبولِ عام نصیب ہوا ہے تو اس کے اسباب اور وجوہات کچھ دوسرے ہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت کی اصل وجہ | یورپ میں عقلیت پرستی نے جنم لیا تو اہلِ کلیسا نے اس

---

[1] یہ مضمون بھی "عقلیت پرستوں کی خام خیالیاں" کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اسے بھی لون کی کتاب "عقلیت سے بغاوت" سے اخذ کیا گیا ہے۔

تحریک کو کسی صحیح راہ پر ڈالنے کی بجائے اس کی اندھا دھند مخالفت شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اہلِ مذہب" اور "اہلِ خرد" دو مخالف اور متحارب گروہوں میں بٹ گئے اور ان دونوں میں بدقسمتی سے ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اس قسم کی تلاطم خیز فضا میں جب لوگوں کے فکری جہاز بالکل بے لنگر ہو چکے ہوں اس بات کی توقع کرنا کہ لوگ افکار و نظریات کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ جذبات کی شعلہ فشانیوں کی بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر کریں گے، بالکل عبث اور بیکار ہے۔ ان حالات میں ہیجانات ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور انہیں نظریات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جو عوام کے دلپسند رجحانات سے ہم آہنگ ہوں۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی شہرت کے پس پردہ بھی دراصل یہی محرک کارفرما ہے۔ اس تحریکِ الحاد میں چونکہ زندگی کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر کرنا مقصود تھی کہ اس کائنات میں اصل صرف مادہ ہے۔ اس لیے مفکرین نے اس قسم کے فلسفے گھڑنے شروع کیے جن کی رو سے نمو، حرکت ارادی، احساس و شعور اور فکر سب اسی مادہ کے خواص قرار پائے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے تربیت پاتے ہیں، اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی ارادہ نہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ پوری کائنات کسی خالق کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اس کائنات کا نظام ایک اندھی بہری قوت کے ہاتھ میں ہے جسے لوگ "لزوم" کہتے ہیں۔ اس نظام میں کسی الہامی ہدایت کی ضرورت نہیں، یہاں کسی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق کے لیے گنجائش نہیں، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء چونکہ ان سب تصورات کے لیے ایک فکری بنیاد فراہم کرتا ہے اس لیے لوگوں نے اسے اپنے دل کی ایک فطری پکار سمجھتے ہوئے نہ صرف اسے فوراً قبول کیا بلکہ مسرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا گویا کہ وہ اس کے لیے پہلے سے سراپا انتظار تھے اور اس تاک میں تھے کہ کوئی اٹھے اور انہیں ایک ایسا عملی مفروضہ (WORKING HYPOTHESIS) مہیا کرے جس کی مدد سے

وہ اپنے فلسفۂ الحاد کی پوری عمارت بآسانی تعمیر کر سکیں۔ مشہور سائنس دان ایکس ہل (UEXHULL) اس نظریہ کی مقبولیت کے اسباب وعلل پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ڈارونیت سائنس سے زیادہ ایک مذہب ہے۔ یہ نظریہ جن حقائق پر مبنی ہے اُن میں وہ منطقی ربط مفقود ہے جو حقیقتاً سائنس کی جان ہوتا ہے لیکن چونکہ اس میں بعض چیزیں لوگوں کی دلپسند ہیں اس لیے اس خامی کے باوجود اس کے خلاف جس قدر دلائل دیئے جاتے ہیں وہ بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ نام ہے ایک ایسے عزم صمیم کا جس کے پیش نظر کائنات سے نظم و ضبط کے اصول کو مٹانا ہے۔ اس طرح سے ارتقاء کا نظریہ ہزاروں لوگوں کا ایک مقدس عقیدہ بن گیا ہے ــــ ایک ایسا عقیدہ جس کا سائنس کی غیر جانبدارانہ تحقیق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ذریعہ ارتقاء کی توجیہ تخلیق کے باطن میں کسی حکیم کے ارادے اور حکمت کو تسلیم یا فرض کیے بغیر کی جا سکتی ہے۔"

ڈارون کے پیشرو | آئیے اب ایک نظر یہ دیکھیں کہ ڈارون سے پہلے کن کن اصحابِ فکر نے اس نظریہ کو پیش کیا۔

ارتقاء کے لفظ کو اگر انواع کی تبدیلی کے ہم معنی لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ کوئی جدید نہیں ہے۔ البتہ اس نظریے نے جو سائنٹفک شکل اختیار کی ہے وہ ضرور جدید ہے اور اس کی تاریخ سترھویں صدی سے پیچھے نہیں جاتی۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ کے سائنٹفک حلقے بکثرت نظریۂ ارتقاء سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔

سیموئیل بٹلر (SAMUAL BUTLER) نے اپنی کتاب ارتقاء قدیم و جدید (EVOLUTION OLD & NEW) میں اس نظریے کی جو تاریخ بیان کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون سے پہلے بفون (BUFFON) اراسمس ڈارون (ERASMUS DARWIN) (چارلس ڈارون کا دادا) اور لامارک (LAMAREK) اس نظریے کو پیش کر چکے تھے۔ بٹلر کی رائے میں ڈارون کی بجائے بفون اس کا مستحق ہے کہ اس کو نظریۂ ارتقا کا پہلا مکتشف قرار دیا جائے مگر

خود بفون نے بھی اس تخیل کا استفادہ ڈے کارٹ (DESCARTES) اور لائبنٹز سے کیا تھا۔

بفون ۱۷۰۷ء میں پیدا ہوا، اور ۱۷۸۸ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ڈارون کا دادا ارسمس ڈارون آیا۔ وہ ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا، ۱۸۰۲ء میں فوت ہوا۔ اُس نے بفون کے نظریے کو اور زیادہ ترقی دی۔ بفون کی رائے یہ تھی کہ ارتقاء نتیجہ ہے حیوان اور اس کے ماحول کے درمیان تعامل کا۔ ماحول نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور ان ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لیے حیوان کی کوششیں اس کے اندر نئی عادتیں پیدا کرتی ہیں اور یہ نئی عادتیں جسم میں تغیر اور نئے آلات کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔

مشہور فرانسیسی نیچری لامارک ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۹ء میں فوت ہوا۔ اس نے اور بھی تفصیل کے ساتھ اس نظریے کو بیان کیا۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ جن اعضاء کو استعمال کرنے کے زیادہ مواقع پیش آتے ہیں۔ وہ ترقی کرتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جن کو استعمال کے مواقع کم پیش آتے ہیں۔ وہ گھٹتے اور رفتہ رفتہ غائب ہو جاتے ہیں۔

ڈارون کی فکری اساس چارلس ڈارون جسے شہرہ آفاق نظریۂ ارتقاء کے منکشف ہونے کا ادعا ہے وہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے دادا کے نظریات پڑھے تھے۔ ارتقاء کا مسئلہ اس کی خاندانی چیز تھا۔ لیکن اسے جس چیز نے ایک "ارتقائی" بنایا وہ مالتھس کے نظریات اور خود اُس کے اپنے اکتشافی سفر تھے جو اس نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۶ء کے دوران ایشیائی جزیروں، جنوبی امریکہ کے ساحلوں، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، مارشس، برازیل میں کیے۔ اس سیاحت سے وہ بہت کچھ مواد لیکر آیا اور اُس کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ ۱۸۳۸ء میں اُس نے مالتھس کا آبادی پر مقالہ پڑھا اور یہاں سے اس کو تنازع للبقا کے نظریے کا سراغ ملا۔

مالتھس جو خاندان کے اعتبار سے ایک پادری تھا، یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی نسل اس تیزی سے بڑھتی ہے کہ وسائلِ معیشت اس کی ترقی اور تکثر کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ڈارون نے اس پر یہ استدلال کیا کہ انسان سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ حیوانات اور نباتات کی نسل بڑھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حیوانات اور نباتات کی تعداد سال بسال بہت زیادہ

بڑھ جاتی ہے۔ لامحالہ کوئی ایسی قوت ضرور ہونی چاہیے جو ان کی تعداد کو ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد بڑھنے سے روک دیتی ہو ورنہ روئے زمین سال دو سال ہی میں انواع حیوانات سے پٹ جائے یہ مامور دافع (ELIMINTING AGENT) ڈارون کی رائے میں تنازع للبقاء ہے۔ اور یہیں سے مشہور نظریہ انتخاب طبیعی (NATURAL SELECTION) کا بھی سرا ملتا ہے۔

ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" (ORIGIN OF SPECIES) کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں تھوڑا بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اگرچہ فرداً فرداً محض خفیف سے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی حقیقی ہوتے ہیں اور انہیں کو افراد کے مواقع بقا میں پوری پوری مداخلت حاصل ہوتی ہے۔ بعض افراد ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور انہیں دشمن سے بھاگ جانے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ بعض دوسرے افراد سردی سے بچنے کا زیادہ سامان رکھتے ہیں اور غیر معمولی سردی میں زندہ رہنے کے زیادہ مواقع انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ ان مشاق ومصون (FOV OURED) افراد کی نسل وراثت میں ان وسائل بقا وتحفظ کو پاتی ہے اور اس طرح اس کو تنازع للبقاء میں کامیابی کے ساتھ دوسرے افراد سے مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر پشت میں وہ افراد جو بقا کی کم تر قابلیت رکھتے ہیں زیادہ تیزی سے مرجاتے ہیں اور ان کی نسل کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جو ان کے مقابلے میں صالح تر افراد ہیں وہ زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں اور زیادہ کثیر نسل چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر پشت میں افراد کی ایک محدود تعداد افزائش نسل سے بچ جاتی ہے اور جو افراد بچ جاتے ہیں ان کے ذریعے وہ مخصوص امتیازی خوبیاں جاری رہتی ہیں جنہوں نے ان کو تنازع للبقاء میں کامیابی کا موقع دیا۔"

ڈارون اپنے اس نظریہ کو زرافہ کی مثال سے واضح کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ قحط اور خشک سالی کے زمانے میں سبزی کھانے والے جانوروں میں جو جانور زیادہ لمبی گردن رکھتے ہیں ان کو کوتاہ گردن والے جانوروں کی بہ نسبت اونچے درختوں کی شاخوں تک پہنچنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور اس لیے وہ زندہ رہنے کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ پہلی قسم کے جانور بقاء اور تناسل میں کامیاب

ہوتے ہیں اور چھوٹی گردن والے جانور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہر پشت میں یہ عمل جاری رہتا ہے اور گردن کی اوسط طوالت ہر پشت میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ وجہ زرافہ کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے

ڈارون کے برعکس لامارک زرافہ کی گردن کو "استعمال" اور "کوشش" کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ جس طرح لوہار کا بازو استعمال سے نمو پاتا اور قوی ہوتا ہے۔ اسی طرح جانور نے گردن کو ابھار کے پتے کھانے کی کوشش کی۔ اس کی گردن بڑھتے بڑھتے لمبی ہوتی چلی گئی۔

لامارک اور ڈارون میں فرق یہ ہے کہ لامارک کی رائے میں زیادہ ہوشیار اور زیادہ کوشش کرنے والا زرافہ خود اپنا انتخاب کرتا ہے اور اپنی کوشش کا انعام بقا کی صورت میں پاتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈارون کے نزدیک انتخاب طبیعی ہر پشت میں اندھا دھند ان زرافوں کا انتخاب کرتا ہے جو اپنی کوشش کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ اتفاقاً زیادہ لمبی گردن سے سرفراز ہوئے ہیں۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ نظریۂ ارتقاء جو جدید تہذیب و تمدن کی فکری اساس ہے۔ اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اُن اعتراضات کو پیش کرتے ہیں جو ڈارون کے اس نظریہ پر مختلف حکما اور اہلِ علم نے پیش کیے۔

ڈارون کی خام خیالیاں سیموئیل بٹلر اس نظریہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر تمام عالم میں نہایت نازک اور حکیمانہ خلقتوں کا ضرورت اور محل کے مناسبِ حال بننا اور ڈھل جانا، محض اتفاقی طور پر مناسبِ حال اسباب کے جمع ہونے کا نتیجہ ہے تو پھر یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اسٹیم انجن کی ایجاد بھی صرف انسان کی اتفاقی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ انسان اس چیز کا قطعاً ضرورت مند نہ تھا لیکن جب بھاپ کا دیوا اتفاق سے معرضِ وجود میں آگیا تو پھر انسان نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

دوسرے اگر انتخاب طبیعی ہی مختلف انواع کے بقا کا ضامن ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر لمبی گردن والے جانور کم کیوں ہیں۔ جس طرح زرافہ اس چیز کا محتاج ہے کہ وہ اونچے درختوں تک رسائی حاصل کرے اسی طرح وہ سارے جانور، جو درختوں کے پتے کھاتے ہیں، وہ بھی اس بات کے حاجتمند ہیں کہ اُن کی گردنیں لمبی ہوں۔ یہ ضرورت تو بے شمار جانوروں کو لاحق ہوتی ہے، اس لیے

ایسے جانوروں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ لیکن امر واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ڈارون دے سکا اور نہ لامارک۔ ڈارون خود اعتراف کرتا ہے:

"میرے لیے اس حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ لمبی گردن جو زرافہ کے حق میں اتنی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے اُسے بقا نصیب ہوا ہے وہ اسی نوع کے دوسرے جانوروں کو کیوں نصیب نہیں ہوئی؟"

اگر ڈارون کا نظریہ صحیح اور درست ہے تو یہ توقع کرنا ہرگز خلاف عقل نہیں ہے کہ ایسے ہی زرافہ کی مانند گردنیں رکھنے والے جانور دنیا کے تمام قطعات میں پیدا ہونے چاہئیں۔ اگر انتخابِ طبیعی کا عمل واقعی دنیا میں جاری ہے تو اس کو عالمگیر ہونا چاہیے اور اس میں یکسانی پائی جانی چاہیے۔

اب ذرا اسی معاملہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔

کوئی شخص اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ خلقت کی ابتدا زیادہ سادہ چیزوں سے ہوئی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ صورتیں رونما ہوئی ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ زمین پر نباتات پہلے پیدا ہوئے، پھر حیوانات کی نوبت آئی، پھر انسان کی۔ مگر یہ ارتقاء لازماً تناسلی ارتقاء نہیں ہے۔ اور تقدم و تاخر زمانی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ متاخر شئے متقدم سے بطریقِ تناسل پیدا ہوئی ہے۔ پہلے چپوؤں سے چلنے والی کشتیاں تھیں، پھر اُن کے چلانے کے لیے بادبانوں کو استعمال کیا جانے لگا اور اب انسان کی قوتِ تخلیق نے انہیں بھاپ کی قوت سے چلانا سیکھا ہے۔ یہ سب کچھ یقیناً ایک ارتقاء اور ترقی ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ سٹیم سے چلنے والے جہاز پرانی کشتیوں کی نسل سے ہیں۔ ہمیں توارث یا وراثت اور اصل و ذریت (DESCENT) کے فرق کو ضرور ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ وہ جانشین بھی تھا اور اس کی نسل سے بھی تھا۔ علاؤالدین خلجی کے بعد غیاث الدین ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ وہ اس کا جانشین و خلف تھا مگر اُس کی نسل سے نہ تھا۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جو شئے باقی رہنے کی صلاحیت

نہیں رکھتی وہ ہلاک ہو جاتی ہے اور جو اصلح ہے وہی الیقی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی دریافت کا سہرا ڈارون کے سر ہو۔ ہر شخص یہ بات شب و روز کے مشاہدے اور تجربے سے جانتا ہے البتہ جو چیز نئی ہے اور جس کا ادعا ڈارون نے کیا ہے وہ یہ مسلّم صداقت نہیں ہے کہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھنے والا زندہ رہتا ہے بلکہ یہ ہے کہ تنازع اصلح ہی انواع کے تغیر و تبدل میں آخری اور فیصلہ کن قوت ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ انتخاب طبیعی کا پورا عمل ایک لگے بندھے ضابطے اور پلان کے مطابق چل رہا ہے اور اس کے پیچھے ایک گہری حکمت اور دانائی موجود ہے جو دنیا کے سارے تغیرات پر پوری طرح فرمانروائی کر رہی ہے۔ ڈارون کے نظریہ میں یہ تضاد بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ اصول پیش کرتا ہے کہ اصلح ہی الیقی ہے مگر دوسری طرف وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ انواع کی تبدیلی سب کچھ بخت و اتفاق سے ہو رہی ہے ڈارون اپنے فکر کی بنیاد کے لیے صرف حیوانات اور نباتات کو لیتا ہے مگر اُس کا یہ اندازِ فکر صحیح نہیں سائنس کے اصولوں کی ایک بنیادی صفت اُن کی ہمہ گیری ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اسی صورت میں صحیح اور درست مانا جاسکتا ہے اگر وہ کائنات کے ہر نوعی تغیر کی وجہ اور علت کی صحیح صحیح نشاندہی کرے۔

ڈارون یہ تو بتاتا ہے کہ حیوانوں نے کس طرح دھیرے دھیرے بالکل تدریجی طور پر نہایت ہی خفیف تغیرات کے جمع ہوتے رہنے سے انسانوں کا روپ دھار لیا اور اس طرح ایک نئی نوع وجود میں آگئی۔ مگر وہ اس کائنات کی ابتدائی کڑیوں سے کچھ بحث نہیں کرتا۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ دنیا میں جو غیر معین توانائی موجود تھی اُس کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ اگر کائنات کا یہ سارا کارخانہ بے مقصد اور بے ارادہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے چل رہا ہے تو پھر فکری دلیل حیران و ششدر رہتی ہے کہ اس بے منصوبہ عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہو گئی۔ ارتقاء کے میکانکی اور اندھے لزوم سے شعور و ذہن کیسے معرضِ وجود میں آگئے۔ معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسان کا دل بیتاب شعور کی اگلی منزلیں جو سلسلۂ ارتقاء میں مضمر ہیں ان کی کنہ معلوم کرنے کے لیے بھی مضطرب رہتا ہے مگر ڈارون اور اس کے ہم خیال اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔

(۳) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انتخاب طبیعی چھوٹے چھوٹے تغیرات کے تدریجی اور آہستہ آہستہ اجتماع کے ذریعہ عمل کرتا ہے تو پھر دنیا کو دو نوعوں کے درمیان تحول پذیر (TRANSITIONAL) صورتوں کے جانوروں سے لبریز ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہم ساری دنیا میں متعین اور مقرر صورتوں کی انواع دیکھتے ہیں۔ پانچ ہزار برس کا تاریخی ریکارڈ اس بات پر شاہد ہے کہ جس شکل و صورت کے جانور آج سے ہزاروں برس پہلے تھے ویسے ہی آج تک ہیں۔ اور کبھی کوئی ایسا جانور نہیں دیکھا گیا جو دو نوعوں کے درمیان عبوری صورت میں ہو۔ یہ اعتراض ایسا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

(۴) انتخاب طبیعی ان خفیف تبدلات کی اصل اور ان کے استمرار کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتا جو اپنے مرحلہ اساس ہیئت (RUDIMENTARY STAGE) میں کچھ بھی مفید نہیں ہوتے۔ جب انتخاب طبیعی کے ذریعہ ایک نوع دوسرے نوع کا روپ دھارتی ہے تو اس تبدیلی کے مابین بہت سے پرانے اعضاء غیر مفید اور بیکار ہو کر خود بخود فنا ہو جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے اعضاء جو ایک بالکل نئی نوع کے بقائی ضمانت ہوتے ہیں خود بخود معرض وجود میں آتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک عجیب و غریب پیچیدگی سامنے آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نئے اعضاء فوراً ہی کام تو نہیں شروع کر دیتے اُن کے مفید اور کارآمد ثابت ہونے سے پیشتر انہیں بہت ہی پُرپیچ مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان درمیانی منازل کی افادیت آخر کس کے حصّہ میں آتی ہے۔ نئی نوع یا پرانی نوع کے۔ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ کوئی نوع تغیّر کی جس منزل میں ہو گی اُسی مرتبہ کے اعتبار سے اعضاء اس کے کام آئیں گے۔ لیکن اس جواب سے ہماری اصل الجھن دور نہیں ہوتی۔ اعضاء تبدیلی کے ہر مرحلہ میں مفید نہیں ہیں۔ بلکہ ارتقاء اور ترقی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر کسی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان عبوری منزلوں میں آخر وہ کونسی قوتیں ہیں جو ایک نوع کو دوسری میں منتقل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں؟ تغیر پذیر حالات میں نو وارد میں اتنی قوت نہیں پیدا ہو سکتی کہ وہ اس عمل کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔ اس کے لیے انہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب وہ قوت و طاقت کے ایک خاص معیار تک پہنچ جائیں۔ پھر انتخاب طبیعی

سے نہایت پیچیدہ اعضاء مثلاً آنکھ کے ارتقاء کی توجیہ نہیں ہو سکتی جو بہت سے اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایسے اجزاء اُس وقت تک کام نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت صحت اور باریکی کے ساتھ وضع نہ کیے جائیں۔

(۵) ڈاروِن کا اعتقاد ہے کہ ارتقاء نتیجہ ہے تنازع للبقاء کا، اور یہ کہ انواع کا تحوّل (تبدیلِ ہیئت یا تحویلِ جسم) اس جگہ بہت نمایاں ہو گا جہاں تنازع للبقاء زیادہ سخت ہو گا لیکن اعداد و شمار ڈاروِن کے اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ ایک روسی ماہرِ نباتات نے ایک لمبے تجربے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر ڈاروِن کے اس خیال کو یکسر باطل ٹھہرایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نئی انواع اُن جگہوں پر جلدی اور آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی اور ترقی کرتی ہیں، جہاں تنازع للبقاء کا عمل بہت کمزور ہوتا ہے۔ یہ عمل تو بجائے نئی انواع کی تخلیق کرنے کے اُن کے تغیّر کے راستے کو روکتا ہے اور یہ کسی صورت میں بھی ان نوعی تغیرات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوتا۔

علمِ اصولِ فقہ کی تدوین

شیخ محمد الخضری بک مرحوم

شریعت کے ماخذ خاتم الرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو شریعت سماوی ہم تک پہنچی ہے اُس کا اصل منبع اللہ کی کتاب — قرآن کریم — ہے، اس کتاب کے مقاصد و مطالب کی تشریح و تبیین صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے قول و عمل — یعنی سنت — سے فرمائی ہے۔ اس بنا پر دونوں، کتاب اللہ اور سنتِ رسول دین میں احکامِ شریعت کا اصل ماخذ اور اساسی ذریعۂ ثبوت قرار پائے۔ اربابِ اجتہاد و تفقّہ، استنباطِ احکام اور استخراجِ مسائل میں انہی سرچشموں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ ائمہ شریعت کی بصیرتِ دینی اور نگاہِ نکتہ شناس پر جب یہ حقیقت کھُلی کہ صاحبِ شریعت نے جو احکام و فرامین امت کو صادر فرمائے ہیں، وہ تمام ایسی حکمتوں سے پُر اور ایسی علتوں سے معلول ہیں جن کی بنیاد امت کے مصالح و منافع پر قائم ہے، تو ائمہ شریعت کے اس نظریے کے نتیجے میں کتاب و سنت ہی کے اندر سے ایک تیسرا ماخذِ شریعت — قیاس — معرضِ وجود میں آگیا۔ حکمِ شریعت کی علت یا تو خود صاحبِ شریعت کی طرف سے متعین اور واضح کردی گئی تھی یا بصورتِ دیگر ائمہ اجتہاد نے قیاس و بصیرت کے ذریعہ اُسے دریافت کیا اور اُس کو حکمِ شرعی کا مدار و محور قرار دے دیا۔ اور پھر ایسے مسائل و معاملات میں، جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں موجود نہ تھے لیکن اُن کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرنا مطلوب تھا، جہاں جہاں اس علت کو موجود پایا، اُسے منصوص و معلول حکم کے دائرے میں شامل کر دیا۔ پھر جب یہ امر بھی ان ائمہ کرام کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ جب مجتہدین کی جماعت کتاب اللہ کے کسی حکم پر، سنتِ رسول کے کسی فیصلے پر یا قیاس سے ثابت شدہ کسی مسئلے پر کلی اتفاق کر لیتی ہے تو من حیث المجموع ان کے اتفاق میں غلطی اور خطا کا احتمال نہیں رہتا تو ان کے اس موقف سے ایک اور اصلِ شرعی — اجماع — وجود میں آگئی۔ اس طرح سے شرعی احکام کے ماخذ — یا فقہاء کی اصطلاح میں ادلۂ احکام — کی تعداد چار

تک پہنچ گئی: کتاب اللہ، سنت رسول، قیاس اور اجماع — لیکن اگر دیکھا جائے تو اصل ماخذ صرف دو ہی ہیں: کتاب اور سنّت اور باقی دونوں انہی اصل ماخذ کی شاخیں ہیں۔

صحابۂ کرام کا طریقۂ اجتہاد قرآن جس زبان میں نازل ہوا وہ عربی تھی، سنتِ رسول نے اس کی توضیح و تبیین عربی زبان میں کی۔ اصحابِ رسول فطری طور پر اس زبان سے واقف تھے۔ وہ اس زبان کے معانی و مطالب کا مکمل درک رکھتے تھے، اس کے اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام کے اقتضاء سے کما حقہ آگاہ تھے۔ ایک طرف وہ خود قلب و نظر کی صفائی و پاکیزگی میں اور ذہن و فکر کی جلا میں یگانہ روزگار تھے اور دوسری طرف انہیں صاحبِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و مجالست حاصل تھی اور وہ احکامِ شریعت کے وجوہ و اسباب سے باخبر رہتے تھے، اس چیز نے انہیں حکمتِ تشریع کا عارف و رازداں بنا دیا تھا چنانچہ انہیں کتاب و سنت سے احکام کے استنباط میں کسی خارجی ذریعہ کی حاجت نہ تھی اور نہ ہی وہ اعراب و اشتقاق کے قواعد، صرف و نحو کے ضوابط اور اسی قسم کے دوسرے علوم و فنون، جو بعد کی پیداوار ہیں، کے محتاج تھے۔ جب کوئی نیا واقعہ اور نیا مسئلہ انہیں درپیش آتا اور اس کے متعلق انہیں حکمِ شریعت دریافت کرنا مقصود ہوتا، تو وہ بلا تامل کتاب اللہ کی جانب رُخ کرتے۔ اگر کتاب اللہ میں انہیں اپنا مقصد و مطلب حاصل نہ ہوتا تو سنّتِ صحیحہ سے رہنمائی طلب کرتے۔ اگر سنّت سے بھی محرومی ہوتی تو پھر وہ اجتہاد و قیاس کا سہارا لیتے۔ ان کا طریقۂ اجتہاد یہ ہوتا تھا کہ وہ کتاب و سنّت میں سے ان احکام کی جستجو کرتے تھے جو پیش آمدہ مسائل و واقعات سے مماثلت و مشابہت رکھتے تھے۔ اور پھر ان نئے مسائل کو انہی ہم شکل اور مشابہت رکھنے والے منصوص احکام کے حکم میں داخل کر دیتے۔ اور اس بارے میں ان تمام مصالح و مراعات کا لحاظ رکھتے جنہیں شریعت نے ہمیشہ اپنے احکام و قوانین میں مدِنظر رکھا ہے — فقہ کی زبان میں اس طریقۂ اجتہاد کو حمل النظیر علی النظیر یا الحاق الاشباہ بالاشباہ سے تعبیر کرتے ہیں — صحابۂ کرام کے اس طریقے کی شہادت ہمیں معاذ بن جبل والی حدیث ملتی ہے، جس میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی گورنری پر روانہ کیا تو معاذ سے دریافت فرمایا کہ معاذ! تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ حضرت معاذ نے سب سے پہلے کتاب اللہ کا نام لیا

کتاب اللہ میں نہ ملنے پر سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا ذکر کیا اور ان دونوں سرچشموں سے رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد و قیاس کا سہارا لینے کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کی اس ترتیب اور راست فکری کی تصدیق فرمادی۔ عہدِ عمر میں بھی اسی قسم کی مثال دستیاب ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو جب قضائے کوفہ کا منصب سونپا تو انہیں منصبِ قضا کی نزاکت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا: الفهم الفهم فيما تلجلج في صدرك مما ليس في كتاب ولا سُنّة فاعرف الاشباه والامثال وقس الامور عند ذالك، واعمد الى اقربها الى الله واشبهها بالحق (جو چیز تم کو قرآن اور حدیث میں نہ ملے اور تمہیں اس کی نسبت شبہ ہو تو اس میں خوب غور و فکر کرو۔ اس کے ہم شکل اور ہم صورت واقعات دریافت کرو، اور ان پر قیاس کر لو۔ اور اس امر کا خیال رکھو کہ جو بات منشائے الٰہی سے زیادہ قریب اور امرِ حق سے زیادہ مشابہت رکھتی ہو اُسی کو اختیار کرو)

صحابہ کے بعد تابعین کی جماعت بھی اس معاملے میں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔

قواعدِ لغت کی تدوین کا پس منظر دورِ صحابہ اور تابعین کے بعد اسلامی فتوحات کی طفیل عرب قوم میں دوسری غیر عرب اقوام کی آمیزش ہو گئی۔ اور عرب و عجم کی ایک مخلوط سوسائٹی وجود میں آ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان جو عربوں کی فطری اور طبعزاد زبان تھی، اب ایک "فن" میں تبدیل ہو گئی، جسے باقاعدہ پڑھا اور پڑھایا جانے لگا، زبان دانی کے لیے قواعد و ضوابط وضع کیے گئے، مختلف کتابوں کی تدوین عمل میں آئی اور پوری سعی کی گئی کہ غیر عرب اقوام کے اختلاط سے عربی زبان ضائع نہ ہو جائے یا اس پر عجمیت کا اس قدر غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنی شکل و صورت کو کھو بیٹھے۔ تاہم اپنی حدِ استطاعت کوششوں کے باوجود روزمرہ گفتگو کی سلاست پسند زبان کو تو اس سیلاب سے یہ لوگ نہ بچا سکے، کیونکہ اس میں اعراب و حرکات کے ترک کر دینے، بعض الفاظ اور صیغوں کو بدل ڈالنے اور ثقیل کلمات کے بجائے ہلکے پھلکے کلمات اختیار کر لینے کی وجہ سے یک گونہ تغیر رونما ہو گیا مگر اہلِ لغت کی یہ کامیابی بھی کچھ معمولی نہ تھی کہ کم از کم انہوں نے لکھنے پڑھنے اور درس و تدریس کی حد تک زبان کو بالکلیہ محفوظ و مصئون رکھا۔ حفاظتِ زبان کے سلسلے میں اس قدر سعی و اہتمام کا مرکزی نقطہ اور بنیادی جذبہ صرف یہ تھا کہ دین کے ستون اور عربی کے مستند علیہ خزانے (کتاب

سنت) زمان و مکان کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

اصولِ فقہ کی تدوین کا آغاز | اس سلسلے میں ائمۂ مجتہدین نے بھی ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا، جس نے اہلِ لغت کے مذکورہ بالا کام کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ وہ کارنامہ یہ تھا کہ ائمۂ لغت نے براہِ راست عرب اہلِ زبان سے میل جول اور ان سے تعبیر و بیان کے گوناگوں اسالیب کا فہم حاصل کرنے کے بعد جو لغت کے قواعد مرتب کیے تھے، ائمۂ مجتہدین نے ان قواعد کی مدد سے اور اپنے اُس علم و عرفان کی مدد سے، جو قدرت نے اُن کو اسلامی قانون کی روح اور مخلوق کو اسلامی قانون کی پابندی کا مکلّف بنانے کی حکمتوں کے متعلق ارزانی فرمایا تھا۔ فقہ و تشریع کے قواعد و کلیات مرتّب و مدوّن کر دیئے۔ اور بعد میں یہی قواعد شریعت کے مآخذ سے احکام و مسائل کا استنباط و استخراج کرنے والوں اور اجتہاد کے منصب پر فروکش ہونے والوں کے لیے اساس و رہنما قرار پائے۔

الرسالہ کے مضامین اور اصولِ فقہ میں اس کی حیثیت | ہمارے تحقیق و مطالعہ کی رُو سے فقہی اور تشریعی اصول کی تدوین و تالیف کی طرف سب سے پہلے جنہوں نے دھیان دیا وہ امام محمد بن ادریس شافعی مطلبی[1] ہیں۔ فقہ میں ان کی مشہور کتاب الام کا مقدمہ جو الرسالہ کے نام سے معروف ہے، انہی قواعد پر مشتمل ہے۔ الرسالہ میں امام موصوف نے سب سے پہلے "بیان" کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن کے بیان، قرآن کے متعلق سنت کے بیان اور اجتہاد و قیاس کے بیان پر جُدا جُدا روشنی ڈالی ہے۔ پھر انہوں نے قرآن کے عام و خاص پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ایک بحث میں انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سنّتِ رسول کتاب اللہ ہی کے حکم کی بنا پر واجب الاتباع ہے۔ آخر میں ناسخ و منسوخ، عللِ احادیث، خبرِ واحد کی حجیّت، اجماع، قیاس، استحسان اور اختلافِ علماء کے موضوعات پر بحث کی ہے۔ الغرض ہماری معلومات کی حد تک اربابِ اجتہاد کی رہنمائی کے لیے سب سے پہلے یہی صحیفہ قواعد فقہی دنیا میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ یہ بدیہی امر ہے کہ جب کسی علم اور فن کی تدوین کا آغاز ہوتا ہے تو ابتدائے کار میں اُس کے جو قواعد و ضوابط وضع ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر ناقص و

[1] مصر میں ان کی وفات ہوئی۔ سنِ وفات ۲۰۴ ہجری ہے۔

ناتمام ہوتے ہیں اور اپنی جزئیات پر پوری طرح حاوی اور جامع نہیں ہوتے۔ مثلاً علمِ نحو کی جب اوّل اوّل ایجاد ہوئی تو یہ علم صرف ان چند جملوں سے عبارت تھا جنہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوالاسود الدؤلی کو املا کرایا تھا لیکن بعد میں بحث و تنقیح کرنے والوں نے انہی جملوں کو اس قدر ترقی دی کہ انہیں مختلف ابواب فصول میں مرتب کیا گیا۔ اُن کی متعدد اقسام و فروع قائم کی گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس علم پر مشتمل بڑی بڑی ضخیم اور مفصل کتابیں تیار ہو گئیں۔ بعینہٖ یہی صورت امام شافعی کے الرسالہ کی ہے، چونکہ یہ علمِ اصولِ فقہ کا سب سے پہلا مجموعہ ہے، اسی لیے اس مجموعے کو اس علم کی خشتِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ اس خشتِ اوّل کے منصۂ ظہور پر آنے کے نتائج اس قدر دُور رس نکلے کہ جلیل القدر علماء و اربابِ نظر کی معتدبہ تعداد اس کی مزید چھان بین اور ترتیب و تنظیم میں منہمک ہو گئی۔

علمِ اصولِ فقہ کے چار بنیادی مباحث

اصولِ فقہ کی تالیف سے ان محققین کا مدعا یہ تھا کہ ایسا ذریعہ مہیا ہو جائے جس کی مدد سے امت کے اہلِ علم و فقہ اور اربابِ قانونِ شریعت کے مآخذ سے احکامِ شریعت تک رسائی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے چار چیزوں کا زیرِ بحث آنا لازم ہے ایک نفسِ حکم دوسرا مآخذ حکم، تیسرے عمل استنباط اور چوتھے صاحبِ استنباط۔ چنانچہ انہوں نے انہی چاروں بنیادی پہلوؤں پر اپنی بحثوں کو منحصر کر لیا اور اپنی تمام تر کدوکاوش کا مرکز قرار دے لیا۔ حکم کی بحث میں انہوں نے حکم کے مختلف مراتب: وجوب، امتناع، استحباب، کراہت، اباحت، حسن، قبح اور ادا و قضا، صحت و فساد وغیرہ پر بحث کی۔ ماخذِ حکم کے باب میں انہوں نے اپنی بحث و تحقیق کے دائرے میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کو شامل کیا۔ عملِ استنباط کے زیرِ عنوان ان کی کدوکاوش کا مقصد استنباط کے طریقے اور احکام کی دلالتوں اور تقاضوں کی نوعیت کا جانچنا اور دریافت کرنا ٹھہرا۔ صاحبِ استنباط کے موضوع میں مجتہد کی ذات، اور عملِ اجتہاد کی شرائط و اوصاف زیرِ بحث لائی گئیں۔

علمِ اصولِ فقہ کے دو بڑے اسکول

علمِ اصولِ فقہ کے میدان میں جن حضرات نے دادِ تحقیق و ترتیب دی ہے، یہ کسی ایک مجمع علمی کی شکل میں نہ تھے بلکہ مختلف بلاد و امصار میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُن میں سے

ہر شخص اپنے ہی علاقہ میں بیٹھا اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور منشائے تالیف کے مطابق اس کام میں مگن تھا، چنانچہ اِس اختلافِ بلاد اور اختلافِ نقطۂ نظر کی وجہ سے محققین اپنے تحقیقی کام میں نہ تو اس فن کے مطالب و حقائق کو ادا کرنے والی اصطلاحات (TERMS) میں متفق القول ہو سکے اور نہ ہی نوعیتِ کار میں ان کے راستے ایک دوسرے سے متحد ہو سکے۔ اور آخر کار علمِ اصولِ فقہ دو قسم کی اصطلاحات میں بٹ گیا۔ یا صحیح لفظوں میں اس میں دو مدرسہ ہائے فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) معرضِ عمل میں آ گئے۔ ایک متکلمین کا مدرسۂ فکر اور دوسرا حنفیہ کا۔

متکلمین کا اسکول اور اس کی خصوصیات اصولِ فقہ کی تالیف میں متکلمین نے جو نظریہ اور اسلوب اختیار کیا وہ علمِ کلام کے زیرِ اثر تھا یعنی یہ لوگ بحث و تحقیق میں علمِ کلام کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ اور اصول و قواعد کا انضباط کرتے وقت وہ اس امر کا خیال نہیں کرتے تھے کہ فروع میں ان قواعد کی موافقت ہوتی ہے یا مخالفت ، عقل اور برہان کی کسوٹی جس اصول کو درست اور معقول قرار دے دیتی تھی اس پر مُہرِ توثیق ثبت کر دیتے تھے اور عقل اور برہان جس کی نفی کر دیتے اُسے یہ بھی مسترد کر دیتے۔ بہت کم مواقع ایسے آئے ہیں جہاں یہ لوگ اپنے مذہب کی فروع و جزئیات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ اور وہ بھی محض سرسری نظر سے۔ گویا اس طریقے کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے عقل و حجت کی روشنی میں قواعد مرتب کیے جاتے تھے اور بعد میں فروع پر ان کا اطلاق و انطباق کیا جاتا تھا۔ اس اسکول سے مختلف مذاہب منسوب تھے۔ معتزلہ کا اسکول یہی تھا۔ اہلِ سنت میں سے شافعیہ اور مالکیہ بھی اسی زُمرے میں شامل تھے

حنفی اسکول اور اس کی خصوصیات اس کے برعکس حنفی اربابِ اصول کے طریقۂ تدوین میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جو قاعدہ اور اصول وضع کیا جائے وہ جامع اور ہمہ گیر ہو اور اپنی فروع اور جزئیات پر پوری طرح حاوی ہو۔ چنانچہ فقہائے احناف اُسی قاعدہ کی توثیق اور اُسی ضابطہ کی تالیف عمل میں لاتے تھے جو اُن کے ائمہ سے منقول ہونے والے جزئی مسائل اور فروعی احکام کی تائید کرتا تھا۔ اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ بلکہ اگر کوئی قاعدہ کسی فقہی مسئلے کی مخالفت کرتا تھا تو اس کی ایسی تراش خراش کر دیتے جس سے فقہی مسئلے کی مخالفت رفع ہو جاتی۔ گویا انہوں نے اُسی رجحان

یا نظریے کو اصول و ضوابط کا لباس پہنا دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے ائمۂ مذاہب نے بھی مسائل و احکام کی تفریع اور تخریج میں اور ان پر شرعی حکم لگانے میں اس کا التزام کیا ہے۔ اس طرزِ فکر کی پابندی نے بعض اوقات ان حضرات سے بڑے بڑے عجیب و غریب اور مضحکہ خیز قاعدے بھی تالیف کرائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں حنفی اصولِ فقہ کے تحت فروع و جزئیات کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ اس لیے کہ قاعدے فروع پر اثر انداز نہیں ہوئے بلکہ فروع قاعدوں پر اثر انداز ہوئی ہیں۔

کلامی اسکول کی بڑی بڑی کتابیں | ائمہ متقدمین کی کثیر تعداد نے متکلمین کے طریقہ پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان تالیفات میں سے سب سے بڑی بڑی کتب جو ہمارے علم میں آئی ہیں، وہ تین ہیں۔ (۱) ابوالحسین محمد ابن علی بصری معتزلی شافعی (متوفی ۴۶۳ھ) کی کتاب المعتمد۔ (۲) ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی نیشاپوری شافعی ـــ جو امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں ـــ (متوفی ۴۷۸ھ) کی کتاب البرہان (۳) ابوحامد محمد ابن محمد الغزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کی کتاب المستصفیٰ۔ مجھے ان کتابوں میں سے المستصفیٰ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ البرہان کے بعض اقتباسات بھی، جو اسنوی[1] نے المنہاج کی شرح میں نقل کیے ہیں، میری نظروں سے گذرے ہیں۔ عربی اسلوب اور زبان کے لحاظ سے المستصفیٰ کی زبان نہایت شستہ اور بلند پایہ ہے۔ غزالی کے بارے میں یہ تو مشہور ہی ہے کہ موصوف کاغذ کے استعمال میں تنگ دل نہیں ہیں۔ المستصفیٰ میں بھی وہ عنانِ قلم کو پوری چھوٹ دے دیتے ہیں تاکہ وہ جہاں پہنچنا چاہے، پہنچ جائے۔ امام صاحب کا زمانہ تلخیص و مختصر گوئی کے دور سے پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں مؤلفین کے پیش نظر اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ قاری کے ذہن میں اپنا مطلب و مفہوم پوری طرح اتار دیں۔ اس سے انہیں بحث نہ ہوتی تھی کہ یہ مقصد مختصر کلام سے حاصل ہوتا ہے یا طولِ کلام سے!

دو جامع کتابیں: المحصول اور الاحکام | ان مؤلفین کے دور کے بعد کلامی اسکول کی مذکورہ کتب کی طرف دو بڑے جلیل القدر اور وسیع النظر عالم متوجہ ہوئے اور ان دونوں نے کتب ثلاثہ کو ایک جامع ملخص کی صورت میں پیش کیا۔ ان میں سے پہلے فخرالدین محمد بن عمر رازی شافعی (متوفی ۶۰۶ھ) ہیں۔ انہوں نے

[1] پورا نام ابو محمد عبدالرحیم ہے۔ بالائی مصر کے شہر اسنا میں ۷۰۴ھ/۱۳۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں آئے اور وہاں سے تعلیم

المحصول کے نام سے ان تینوں کتابوں کی تلخیص کی ہے۔ دوسرے ابوالحسن علی بن ابی علی شافعی۔ جو سیف الدین آمدی کے نام سے مشہور ہیں۔ (متوفی ۶۳۱ھ) ہیں۔ انہوں نے الاحکام فی اصول الاحکام کے نام سے ان کا خلاصہ مرتب کیا ہے۔ یہ دونوں جامع کتابیں عبارت کے لحاظ سے بڑی مبسوط اور واضح ہیں۔ مطالعہ کرنے والا صرف انہی پر اکتفا کر سکتا ہے۔ اسے مطلب اور مفہوم سمجھنے کے لیے کسی طویل شرح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ المحصول کی زبان نسبتہً زیادہ واضح اور سلیس ہے۔ مصر کے دارالکتب الخدیویہ میں المحصول مکمل موجود ہے۔ الاحکام کے بھی اکثر حصے موجود ہیں۔

المحصول کے مختصرات | بعد میں ان دونوں کتابوں کی متعدد تلخیصات اور مختصرات لکھی گئی ہیں المحصول کا ایک اختصار تاج الدین محمد بن حسن ارموی (متوفی ۶۵۶ھ) نے کیا ہے۔ جو الحاصل کے نام سے معروف ہے۔ ارموی نے یہ اختصار ابوحفص عمر بن الصدر الشہید کے مشورے سے لکھا تھا۔ دوسرا اختصار محمود بن ابی بکر ارموی (متوفی ۶۷۲ھ) نے اپنی کتاب التحصیل میں کیا ہے۔ موصوف کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں: آجکل لوگوں کی ہمتیں اس علم کے اونچے مطالب تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں، حتیٰ کہ المحصول اپنے نظم و ترتیب کی شستگی اور حجم کے اعتدال و لطافت کے باوجود اکثر لوگوں کی نگاہ میں بھاری سمجھی جاتی ہے چنانچہ چند احباب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو مختصر کر دوں اور مزید اپنی جانب سے اس پر توضیحی نوٹ دے دوں، میں نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے التحصیل کے نام سے اس کا ملخص تیار کیا ہے۔ قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب منہاج الوصول الیٰ علم الاصول بھی الحاصل سے ماخوذ ہے۔ مگر یہ بات کہے نہیں رہا جاتا کہ ان تمام حضرات نے اس درجہ زیادہ اختصار سے کام لیا ہے کہ ان کا کلام چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصدِ تالیف افہام و تفہیم سے بالا تھا یہی وجہ ہے کہ

م۔ حاصل کی۔ شافعی المسلک ہیں۔ ان کی تالیفات میں سے ایک المنہاج کی شرح ہے۔ اور ایک رسالہ فی عدم استخدام اہل الذمہ و عدم تبلیتھم عموم المسلمین ہے۔ جو مخطوطے کی شکل میں تونس میں موجود ہے۔ ۷۰۰ھ میں وفات ہوئی

ؔ ارموی آذربائیجان کے شہر ارمیہ کی طرف منسوب ہیں۔

ان کی کتابیں مزید شروح کی محتاج ہوئیں تاکہ ان کی چیستان کی توضیح اور ان کے معموں کی تحلیل کریں۔ چنانچہ قاضی بیضاوی کی منہاج الوصول کی ایک نہایت عمدہ شرح اسنوی نے لکھی ہے۔ اسنویؒ شرح کے آغاز میں رقمطراز ہیں: "اس زمانے میں علمِ اصولِ فقہ سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگ اس علم کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہو کر صرف المنہاج پر اکتفا کر چکے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب ضخامت کے لحاظ سے چھوٹی ہے۔ لیکن اس میں معلومات اور مطالب بڑی افراط سے جمع ہیں اور اس کی زبان نہایت لطیف اور رواں ہے۔ اسنوی کا یہ تبصرہ میرے لیے بڑا حیرت افزا ہوا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ المنہاج میں زبان کی لطافت اور روانی کہاں سے آگئی حالانکہ اس کا پورا کلام اغلاق و ابہام کا مرقع ہے۔ مجھے جب کبھی کسی مسئلے کے بارے میں اس کی طرف مراجعت کی ضرورت پڑتی ہے تو میں المنہاج کی متن خوانی پر اپنی جان گھُلانے کے بجائے المنہاج کے شارح کی طرف رُخ کرتا ہوں اور اُنہی سے امداد طلب کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسنویؒ جس خوبی سے مطالب کی شرح و تبیین کرتے ہیں۔ اس بارے ان کے ہم پلہ کوئی شارح میری نظر میں نہیں آیا۔

الاحکام کے مختصرات آمدی کی کتاب الاحکام کا اختصار سب سے پہلے ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بابن حاجب المالکی (متوفی ۶۴۶ھ) نے کیا ہے۔ یہ اختصار منتہی السؤل والامل فی علم الاصول والجدل کے نام سے موسوم ہے، اور علمی حلقوں میں خاصا شہرت یافتہ ہے۔ ابن حاجب نے اپنے اسی مجموعے کا ایک اور خلاصہ لکھا اور اسے مختصر المنتہی کا نام دیا۔ اس خلاصے کی عبارت المنہاج سے ملتی جلتی ہے۔ مختصر المنتہی کی سب سے بہترین شرح عضد الدین عبد الرحمن بن احمد ایجیؒ[1] (متوفی ۷۵۶ھ) کی ہے لیکن اپنی عمدگی کے باوجود اسنوی کی شرح المنہاج سے کم پایہ ہے۔

حنفی اسکول کی بڑی بڑی کتابیں اصولِ فقہ میں حنفیہ کے طرزِ تدوین پر اصول کی کتابیں تالیف کرنے والوں کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ جو زمانۂ قدیم کے نوابغ ارباب اصول سے لے کر متاخرین کے دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ متقدمین میں سے جن بزرگوں نے اس فن کو غیر معمولی نشوونما دی ہے اور اس پر

---

[1] ایجی کی نسبت مدینہ ایج کی طرف ہے۔ یہ شہر فارس کے شمال میں آخری کنارے پر واقع ہے۔

نہایت ضخیم و بسیط مجموعے تصنیف کیے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل حضرات کے اسماء گرامی نمایاں ہیں:۔

۱۔ ابوبکر احمد بن علی۔ یہ بالعموم جصّاص کے لقب سے موسوم ہیں۔ ان کا سنِ وفات سنہ ۳۷۰ھ ہے۔

۲۔ ابوبکر عبیداللہ بن عمر القاضی الدبوسیؒ[1]۔ متوفی سنہ ۴۳۰ھ۔

۳۔ شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسیؒ[2]۔ متوفی سنہ ۴۸۳ھ۔

میرے مطالعہ میں متقدمین کی کتابوں میں سے سب سے عمدہ اور مفید کتاب فخر الاسلام علی بن محمد البزدویؒ[3] (متوفی سنہ ۴۸۲ھ) کی کتاب الاصول آئی ہے۔ علاؤ الدین عبدالعزیز بن احمد البخاری (متوفی سنہ ۷۳۰ھ) نے اس کی ایک نہایت بلند پایہ اور عظیم شرح بھی لکھی ہے۔ متأخرین حنفیہ میں سے علم اصول پر سب سے مشہور کتاب عبداللہ بن احمد نسفی کی کتاب المنار ہے۔

دونوں مدرسہ ہائے فکر کی جامع کتب

متأخرین حنفیہ اور دوسرے مذاہب کے علماء کا ایک گروہ ایسا بھی گذرا ہے جس نے حنفیہ اور متکلمین کے دونوں طریقوں کی جامع کتب لکھی ہیں۔ مثلاً بغداد کے مشہور حنفی عالم مظفر الدین احمد بن علی الساعاتی (متوفی سنہ ۶۹۴ھ) نے فخر الاسلام بزدوی کی الاصول اور آمدی کی الاحکام کا ایک مجموعہ تالیف کیا ہے جس کا نام "بدیع النظام الجامع بین کتاب البزدوی والاحکام" ہے اسی نوعیت کی ایک کتاب صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود بخاری حنفی (متوفی سنہ ۷۴۷ھ) نے تنقیح الاصول کے نام سے تحریر کی ہے۔ پھر صدر الشریعۃ نے خود ہی التوضیح کے نام سے اس کی شرح کی ہے۔ تنقیح الاصول بزدوی کی الاصول، رازی کی محصول اور ابن حاجب کی تلخیص منتہی السؤل کا ملخّص ہے۔ صدر الشریعۃ کی شرح التوضیح پر شافعی عالم سعدالدین مسعود ابن عمر تفتازانی (متوفی سنہ ۷۹۲ھ) کا حاشیہ بھی بہت بڑی

---

[1] دبوسیہ سمرقند کے صدر مقام صغد کے ماتحت شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے۔ ابوزید اسی شہر کے رہنے والے تھے اور اسی وجہ سے دبوسی کہلائے۔ یاقوت نے ان کا سنِ وفات سنہ ۴۰۲ھ لکھا ہے۔ [2] سرخس خراسان کے نواح میں ایک شہر کا نام ہے اور نیشاپور اور مرو کے درمیان واقع ہے۔ اسے سَرَخس بفتح راء بھی پڑھتے اور سَرْخس بسکون راء بھی۔ [3] بزدہ نسف سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ایک نہایت محکم اور مضبوط قلعے کا نام ہے۔ نسف دریائے جیحون اور سمرقند کے درمیان ایک بہت بڑا شہر ہے۔ بزدوی قلعہ بزدہ کی جانب منسوب ہیں۔

شہرت کا حامل ہے علیٰ ہذا القیاس، کمال الدین محمد بن عبدالواحد حنفی ۔ جو عام طور پر ابن ہمام کے نام سے شہرت رکھتے ہیں ۔ (متوفی ۸۶۱ھ) کی کتاب التحریر اور التحریر کی شرح ، جو ابن ہمام کے شاگرد محمد بن محمد امیر حاج الحلبی (متوفی ۸۷۹ھ) نے لکھی ہے اور تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی شافعی (متوفی ۷۷۱ھ) کی کتاب جمع الجوامع دونوں اسکولوں کی جامع کتب کی فہرست میں شامل ہیں۔ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب جمع الجوامع کے شروع میں تصریح کی ہے کہ ان کی یہ کتاب فنِ اصول کی تقریباً یکصد کتابوں کا نچوڑ ہے ۔

مذکورہ کتب کی خصوصیات | مذکورۂ بالا کتب ، جن میں فنِ اصول کی ہر بات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے ، ایجاز و اختصار کا انتہائی نمونہ ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی عبارت بالکل ایک پہیلی اور کلامِ معجز کی صورت اختیار کر گئی ہے ۔ اور زبان کے لحاظ سے بھی عربیت سے بالکل غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں ابن ہمام کی التحریر کو تو اس معاملے میں سبقت حاصل ہے۔ اس کو شرح سے الگ کر کے اگر کوئی شخص پڑھے اور قائل کی مراد معلوم کرنا چاہے تو اس کے لیے سعی و محنت کا اسی قدر سرمایہ درکار ہوگا جس قدر معموں کو حل کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اگر اسے ابنِ حاجب کی شرح کی طرف رجوع کرنے سے پہلے پڑھا جائے اور بعد میں ابنِ حاجب کی شرح کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ابنِ حاجب کی عبارت کو لیتا ہے اور اس کی اس قدر تراش خراش کرتا ہے اور اس کے الفاظ و تراکیب کو ادل بدل کرتا ہے کہ عبارت مضطرب اور پیچیدہ ہو جاتی ہے اور اس میں اغلاق کی کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔ سبکی کی جمع الجوامع مختلف اقوال کے مجموعے سے عبارت ہے۔ کوئی قاری یا سامع اس کے متن سے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں اس میں اصولِ فقہ کے جن قواعد و ضوابط کو ذکر کیا گیا ہے ان کا استدلال و استناد سرے سے مفقود ہے۔

دورِ جمود میں اصولِ فقہ کی حالت | بعد کے ادوار میں علمِ اصولِ فقہ کے جس قدر مصنفین و مؤلفین آئے ہیں اُن سب کی تگ و دو صرف کتبِ سابقہ کی تشریحات اور حاشیہ نویسی تک محدود رہی ہے۔ اس علم

میں انہوں نے اپنی جانب سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور نہ اس کے کسی پہلو کو مزید ارتقاء دینے کی کوشش کی۔ ان کا سرمایۂ محنت زندگی بھر اسی میں کھپتا رہا کہ وہ ملخصات کی تشریح کریں۔ ژولیدہ عبارتوں کو حل کریں، پیچیدہ اور مبہم کلام کو واضح اور بامعنی کریں۔ ان کے اپنے اندر اجتہاد و فکر کی قوتیں بانجھ پن کا شکار اور ترجیح و انتخاب کا ذوق تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان ادوار میں اجتہاد کے دروازے پر قفل لگ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے علمِ اصولِ فقہ کی حیثیت آثارِ کہنہ (RELICS) کی سی ہو گئی تھی۔ اس لیے اصولِ فقہ کی بحثوں میں پڑنے اور استنباط و قیاس کے قاعدوں (جن کا تعلق اجتہاد سے ہے) میں قابلیتیں اور محنتیں صرف کرنے کی کوئی ضرورت اور کوئی افادیت محسوس نہ کی گئی۔ متاخرین کی کتب میں سے دقیق ترین کتاب مُسلّم الثبوت ہے، جس کے مؤلف محب اللہ بن عبدالشکور (متوفی ۱۱۱۹ھ) ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ اصولِ فقہ پر اس کثرت اور وسعت سے لٹریچر وجود میں آیا ہے، لیکن اصحابِ اصول میں سے کسی نے ان اصولوں اور کلیوں کے بارے میں راہوارِ قلم کی جولانی نہیں دکھائی۔ جن اصولوں اور کلیوں کو خود صاحبِ شریعت نے تشریع و تقنین کے باب میں معتبر و ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہی اصول فی الحقیقت قیاس اور استنباط کا مبنیٰ اور اساس ہیں۔ کیونکہ قیاس کی اصل روح وہ علتیں ہیں جو شریعت کے احکام میں کارفرما ہیں اور ان کا مدار و مناط ہیں۔ ان علتوں کا ایک حصہ وہ ہے جن کا مدارِ حکم ہونا خود شارع سے منصوص ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جن کا استخراج مجتہدینِ امت نے کیا ہے اور ان کو احکام میں معتبر و مؤثر گردانا ہے۔ انہی علتوں سے وہ اصول و قواعد مرتب ہوئے ہیں جن پر قیاس کی عمارت قائم ہے۔ چنانچہ بہتر یہ تھا کہ ذہن و فکر کا زیادہ تر زور انہی اصولوں کی توضیح و ترتیب پر صرف کیا جاتا، تاکہ یہ اصول مجتہدین و فقہاء کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔ اور اجتہاد و استنباط کا کارواں انہی کی روشنی میں پوری تازگی کے ساتھ رواں دواں رہے۔ یہ کام اس سے بہتر اور نتائج کے لحاظ سے بڑا مفید ہے کہ وقت اور قوت کو خلافیات و جدلیات میں اکارت کیا جائے اور ایسے مسائل پر کشمکش برپا رکھنے میں ضائع کیا جائے، جن کی مخالفت یا موافقت پر کوئی حکم شرعی مترتب نہیں ہوتا۔ غالباً اربابِ اصول نے ان قواعد و کلیات پر بحث و تحقیق کا کام فقہاء اور مجتہدین کے لیے مختص کر دیا تھا، حالانکہ ان کا زیادہ تعلق اصولِ فقہ کے

فن سے ہے۔

اصولِ فقہ پر بہترین کتاب ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (متوفی سنہ ۷۸۰ھ) کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے مذکورۂ بالا امور کی جانب توجہ مبذول کی ہے۔ اور اصولِ فقہ میں صاحب شریعت کے اختیار کردہ اصولوں کو بھی لیا ہے اور ان کی تشریح و توضیح کی ہے۔ اس لحاظ سے شاطبی کی الموافقات کو میں نے بہترین کتاب پایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب عظیم فائدوں کی حامل ہے۔ عبارت و اندازِ بیان نہایت سہل اور رواں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کتاب کی حاجت باقی نہیں رہتی، تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ والسلام۔

(ترجمہ و ترتیب:۔ خلیل حامدی)

اسلام کے اصولِ معاہدات

(از: شیخ محمد شلتوت، مصری)

دعوتِ اسلامی سے پہلے عالمِ انسانی پر جس چیز نے اپنا سکہ جاری کر رکھا تھا اُسے اگر ہم ایک کلمے سے تعبیر کریں تو وہ "خود سری" تھی۔ عقیدہ و فکر پر اسی کا تسلط تھا، اجتماعی تعلقات میں اسی کی کارفرمائی تھی۔ نظامِ حکومت اسی کے زیر اثر تھا —— یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حیوانی جذبات اور بہیمانہ جوش و جنون ہی دراصل عالمِ انسانی کے کرتا دھرتا تھے، انہی کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار کی زمام تھی اور انہی کی منشا کے مطابق تعلقات و روابط طے پاتے تھے۔

اب ظاہر ہے کہ حیوانی جذبات کی قلمرو میں فرد اور فرد کے مابین اور قوم اور قوم کے درمیان تعلقات کی نوعیت قوت اور کمزوری کے پیمانہ کے لحاظ سے ہی متعین ہو سکتی ہے چنانچہ اُس وقت بھی یہی پیمانہ رائج تھا اور اسی کے نتیجے میں طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا، توانا ناتواں کا حق غصب کر لینے میں کوئی حرج نہ سمجھتا تھا اور غالب مغلوب کا خون نچوڑ لینے کو پیدائشی حق تصور کرتا تھا۔ الغرض قوت و قہر، جبروت و کبریائی اور سلب و نہب کی ہر سو فرمانروائی تھی۔

اسلام کی داخلی و خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد ان ہنگامہ ہائے رستاخیز اور غلغلہ ہائے دار و گیر کے عین شباب میں خورشیدِ اسلام مطلع عالم پر نمودار ہُوا۔ اس کی عالمتاب شعاعوں کے ذریعے ذاتِ خداوندی نے انسانوں پر امن و سلامتی کی راہ کھولی اور کفر اور سرکشی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان و رحمت کے نور کی جانب ان کی رہنمائی کی چنانچہ اسلام نے اس سرکش اور جارح ماحول کے اندر انسانوں کو وحدتِ انسانیت کی دعوت دی۔ اس وحدت میں قومیت و رنگ و نسل کی بنا پر تفرقہ اندازی اور گروہ سازی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اسی طرح اسلام نے دوسرے جس اصول کا اعلان کیا وہ بے لوث عدل و انصاف تھا جو یگانے اور بیگانے کے تصور سے پاک، دوست و دشمن کی تفریق سے ناآشنا، قوی و ضعیف کے امتیاز سے

مبرا ــــ بلکہ مومن اور کافر کی تمیز تک سے بے لاگ تھا۔ اسی حقیقت کی جانب قرآن توجہ دلاتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدہ)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۔ (النساء: ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور خدا کے واسطے (یعنی صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر) گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

ان دونوں اصولوں ــــ وحدت انسانیت اور بے لاگ عدل ــــ کی بنیاد پر اسلام نے اپنی مصلحانہ اجتماعی پالیسی کی عمارت قائم کی اور انہی کے تحت مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت متعین کی اور انہی کی روشنی میں مسلمانوں اور غیر مسلم قوموں کے مابین اصول روابط وضع کیے۔ اور پھر مسلمانوں اور غیر قوموں کے درمیان جنگ اور صلح کی دونوں حالتوں میں اپنی اس پالیسی کی انتہائی پابندی کی۔ اور اس سلسلے میں یہاں تک اعتنا برتا کہ بین الاقوامی تعلقات کے ان تمام قواعد و ضوابط کو تفصیل سے بیان کر دیا۔ جو قومی وجود کے تحفظ اور دنیا میں عدل و انصاف کا علمبردار بننے کے لیے ناگزیر ہیں۔

ہم یہاں ان تمام بین الاقوامی ضابطوں میں صرف معاہدات کو دو پہلوؤں سے بیان کریں گے۔ ایک یہ کہ وہ اصول کیا ہیں جنہیں اسلام کسی دوسرے شخص یا گروہ یا قوم سے معاہدہ استوار کرنے کی اساس قرار دیتا ہے، اور دوسرا یہ کہ معاہدے کے ایفاء اور معاہدے کے فسخ کے بارے میں اسلام کی

کیا ہدایات ہمیں ملتی ہیں ؟

توثیقِ معاہدہ کے بارے میں اسلام کی شرائط۔ پہلی شق یعنی توثیقِ معاہدہ کی اساس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ کا ماحصل یہ ہے کہ :۔

(ا) اسلام کسی غیر قوم یا گروہ سے کوئی ایسا معاہدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو اسلام کے اساسی اصولوں اور اس کی بنیادی تعلیمات پر اثر انداز ہوتا ہو۔

(ب) اسلام کی نگاہ میں صحیح اور قابلِ النفاذ وہی معاہدہ ہے جس کے طے کرنے میں دونوں فریقوں کی آزادانہ رضامندی اور اطمینانِ قلب شامل ہو۔

(ج) یہ ضروری ہے کہ جو معاہدہ بھی کیا جائے اُسے ایک واضح اور غیر مبہم دستاویز کی صورت دی جائے جس میں دونوں فریقوں کے حقوق و فرائض اور شرائط و التزامات کو صاف صاف متعین کر دیا گیا ہو تاکہ کسی فریق کے لیے غلط تاویل و تعبیر کی گنجائش باقی نہ رہے۔

مذکورۂ بالا تینوں اصولوں کے مطالعہ سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسا کوئی معاہدہ قابلِ قبول نہیں ہے جس میں کوئی ایسا جز پایا جاتا ہو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ [illegible] کے اندر اسلام کی بے حرمتی کا باعث ہو جیسے اللہ کے نازل کردہ قوانین کے خلاف فیصلوں کو جائز قرار دینا، یا غیر مسلموں کو بلادِ مسلمین کے اندر ایسے حقوق عطا کر دینا جو مسلمانوں کے اختیاراتِ حکومت کی نفی کرتے ہوں۔ اسی طرح اسلام کسی ایسے معاہدے کو بھی سندِ جواز نہیں دیتا جو تخویف و تہدید، قہر و غلبہ اور حالات کا دباؤ ڈال کر منعقد کیا گیا ہو۔ اور نہ ہی اسلام کسی ایسے معاہدے کو تسلیم کرتا ہے جو الفاظ کی حد تک تو معاہدہ ہو۔ لیکن یہ الفاظ صرف شاطرانہ فریب کاری کے لیے ہوں ورنہ فی الحقیقت یہ معاہدہ فریقِ ثانی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اُس کی دولت و ثروت کو ہڑپ کرنے کے لیے بطور حربہ اختیار کیا گیا ہو۔

مذکورہ قواعد کے دلائل مذکورہ بالا قواعد و ضوابط کا ایک عام ماخذ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک ہے کہ کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل (جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ

باطل ہے، لیکن ہمیں اس سلسلے میں قرآن کریم کی واضح نصوص بھی ملتی ہیں، مثلاً معاہدات کو فریب کاری کا ہتھیار بنانے کی ممانعت میں قرآن کریم کا ارشاد ہے :۔

تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امۃ ھی اربی من امۃ۔ انما یبلوکم اللہ بہ۔ (النحل) — تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے، حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

ولا تتخذوا ایمانکم دخلا بینکم فتزل قدم بعد ثبوتھا۔ (النحل) — (اور اے مسلمانو!) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے۔

ان آیات میں قسموں سے مراد وہ حلف ہیں جو توثیق معاہدات کے وقت اٹھائے جاتے ہیں یا وہ قول و قرار ہیں جن کی اطاعت کا عہد ایک دوسرے سے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ دخل کے معنی فریب کاری، منافقت، جعل سازی اور ریشہ دوانی کے ہیں۔ موجودہ ڈپلومیسی میں جس فریب کاری کو عین دانشمندی اور فتح تصور کیا جاتا ہے، اسلام کی نگاہ میں توثیق معاہدہ کے بعد اس قسم کی فریب کاری سخت ملعون اور قابلِ مذمت ہے۔

اسلام کے ان اصولِ معاہدات کو آپ ایک جانب رکھیں اور دوسری جانب ان معاہدات کو رکھیں جو دورِ حاضر میں ترقی یافتہ اقوام کی طرف سے طے کیے جاتے ہیں، ان دونوں کے موازنہ سے یہ بات ایک کھلی حقیقت کی طرح آپ کے سامنے آجائے گی کہ ان اقوام کے معاہدات کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ انہیں لقمہ تر بنانے کے لیے ہیں، امن و سلامتی کی پناہ گاہ نہیں بلکہ شر و فساد کا سرچشمہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان معاہدات نے پوری دنیا کو سعادت و فلاح سے بہرہ ور کرنے کے بجائے شقاوت و نکبت کے جہنم میں جھونک رکھا ہے۔

معاہدہ کے ایفاء و نقض کے بارے میں اسلامی احکام | اسلام اس امر کا پُرجوش علمبردار ہے کہ جب کوئی

معاہدہ سابقہ اصولوں کی روشنی میں صحت مندانہ طریقے سے طے پاجائے تو جب تک وہ معاہدہ قائم ہے اُس کی ہر لحاظ سے ظاہراً و باطناً وفاداری اور پابندی کی جائے۔ اور اُس کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کرنے یا کسی تقاضے کو پامال کرنے کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔ قرآن کریم نے اس بارے میں نہایت صریح اور محکم ہدایت کردی ہے:-

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) — عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو پوری پوری جواب دہی کرنی ہوگی۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا (النحل) — اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے کوئی عہد اس سے باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔

ان دونوں آیات میں محض اخلاقی ہدایت ہی نہیں دی گئی ہے، بلکہ یہ اسلامی حکومت کی داخلی و خارجی سیاست کی سنگِ بنیاد قرار پائی ہیں۔

نقضِ معاہدہ کے لیے اسلام نے صرف دو ہی صورتیں قرار دی ہیں:-

پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو فریقِ ثانی سے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا، اس صورت میں اسلامی حکومت کو یہ اجازت ہے کہ وہ خود اقدام کر کے معاہدے کو فسخ کر دے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ صرف اپنی جگہ پر فسخ معاہدہ کا فیصلہ کر کے نہ بیٹھ رہے بلکہ اپنے اس فیصلے سے فریقِ ثانی کو فوراً مطلع کر دے، سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے اسی صورت کو بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے:-

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ[1] — اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا خدشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تشریح میں صاحبِ تفہیم القرآن نے جو نوٹ رقم فرمایا ہے اُس کا مطالعہ بھی کر لیا جائے:- (مترجم) (دیکھئے اگلے صفحہ پر)

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدہ پہلے خاص حالات کے تحت طے کیا گیا ہو، لبعد میں وہ حالات

"اس آیت کی رُو سے ہمارے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے، یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریقِ ثانی کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا، تاکہ فسخِ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے ویسا ہی اُس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمانِ الٰہی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ "من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدہ حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء" جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔" پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ: لا تخن من خانک "جو تیری خیانت کرے تو اس کی خیانت نہ کر۔" اور یہ اصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہ نے اپنے عہد بادشاہی میں سرحدِ روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکایک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عمرو بن عَنْبَسَہ صحابی نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حدیث سنا کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔ آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماعِ فوج روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخِ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگِ عظیم ثانی میں روس

بدل گئے ہوں اور اب اسلامی حکومت کے اربابِ حل و عقد کی رائے میں اس معاہدے کا قائم و بحال رہنا

پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملہ سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھا لیتا لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعلساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے اُن بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جبکہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کر دینے کو جائز رکھتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی الاعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق فسخ معاہدہ کا نوٹس دیں۔ بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علانیہ توڑ دیا تو آپ نے پھر انہیں فسخ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدۂ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیش نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی، تاکہ پیروی ہو تو آپ کے پورے طرز عمل کی ہو نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جزو کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

اولاً، قریش کی خلاف ورزیٔ عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نقض عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ابو سفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقض عہد قوم کو خود بھی اپنے نقض عہد کا اعتراف ہو، البتہ یہ ضروری ہے کہ نقض عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو

قوم کے لیے نقصان دہ ہے، اور اس کے ذریعے سے جو تحفظات اور منافع حاصل ہو رہے ہوں، اُن سے بدرجہا زیادہ اس سے مفاسد و مضرات پیدا ہو رہے ہوں۔ اس صورت میں اسلامی حکومت پر واجب ہے کہ وہ معاہدہ کو فسخ کر دے اور اس کی اطلاع معاہد قوم تک پہنچا دے۔ ذیل کی آیت سے اس امر کی رہنمائی ملتی ہے:

واذان من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٔ من المشرکین و رسولہ۔ (التوبہ)	اطلاع عام ہے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔

۳۔ ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایما نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپ ابھی تک اُن کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آکر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپ نے اُسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً، قریش کی جنگی کارروائی آپ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپ کے طرزِ عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، لہٰذا آیتِ مذکورہ بالا کے حکم عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو ویسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقہ سے کی جاسکتی ہے جو حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہد قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنید یا بین الاقوامی ثالثی کے ذریعہ سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی، یا یہ کہ فریق ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تلا ہوا ہے تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں۔ لیکن آیت مذکورہ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمالِ طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کھلم کھلا ہونا چاہیے۔ چوری چھپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا علانیہ اقرار کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں، ایک بد اخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۵۵ نوٹ ۴۲)

(معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلانِ عام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اُن تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود بہ نسبہ اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ اور موقع پاتے ہی پاسِ عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اُتر آتے تھے)

البتہ دوسری صورت میں اس امر کا لحاظ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاہدہ مدتِ معینہ کے ساتھ مقید ہو تو مدت پوری ہونے تک اس کی پابندی کی جائے ۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۔ (التوبہ)

بجز اُن مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی ۔ اور نہ تمہارے خلاف کسی کی امداد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو ۔

یہ استثناء اسی مذکورہ بالا اطلاعِ عام سے ہے ۔ اور اسے جس شرط سے مشروط کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ معاہد قوم نے مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا کارروائی نہ کی ہو ، بلکہ عہد کا پاس رکھا ہو لیکن مجموعی طور پر مسلمانوں کو ان کے ساتھ بقائے معاہدہ میں فائدے سے زیادہ نقصان ہو ، اس لیے معاہدہ کو درمیان میں منسوخ کر دینے کے بجائے اختتامِ مدت کا انتظار کیا جائے ۔

معاہدات کے عقد و فسخ کے بارے میں اسلام کی یہ پالیسی اور اصول و ضوابط بین الاقوامی خیر سگالی اور امن و سلامتی کی فضا قائم رکھنے کی جو خوبیاں اپنے اندر مضمر رکھتے ہیں ، وہ کسی منصف مزاج شخص سے مخفی نہیں ہیں ۔ اگر مغربی تہذیب کے شیدائی ان اصول و ضوابط کا مطالعہ کریں اور اپنی پالیسیوں کو ان کے مطابق ڈھالیں تو بلا شبہ حرص و ہوا اور جوع الارض کے ہلاکت خیز طوفانوں اور ظلم و جور اور مکر و فریب سے بھرپور ڈپلومیسیوں کی وجہ سے دنیائے انسانیت پر جو پے در پے نکبت و ہلاکت کے دورے پڑ رہے ہیں ان سے دنیا کو نجات مل سکتی ہے ۔ اور ہر قوم اپنے طبعی حقوق سے متمتع ہونے کا موقع پا سکتی ہے ۔ بلکہ اس سے خود علمبرداران تہذیب جدید کے دعاوی امن و فلاح بھی خلقِ خدا کی نگاہ میں اطمینان و یقین کا باعث ہو سکتے ہیں ۔

(ترجمہ و ترتیب : خلیل احمد)

رسائل و مسائل

تبلیغی جماعت اور جماعتِ اسلامی

سوال: ایک بات عرصہ سے میرے ذہن میں گشت کر رہی ہے جو بسا اوقات میرے لیے ایک فکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ میں اللہ سے خصوصی طور پر اس امر کے لیے دعا کرتا ہوں کہ وہ آں ذی علم اور باصلاحیت حضرات کو اس طرف متوجہ کر دے جن کی کوششوں میں بہت سی تاثیر پوشیدہ ہے۔ جن کے قلب و دماغ کی طاقت سے بہت کچھ بن سکتا ہے اور بگڑ سکتا ہے۔ امت کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے تفرقے بھی مٹ سکتے ہیں تعمیری انقلاب بھی برپا ہو سکتا ہے اور وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو ناممکن نظر آتا ہے۔ ویسے ہی لوگوں کی قوتِ فکر کی یکجائی اور ہم آہنگی کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔

جس بات کو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ بہت بڑی اور اُلجھی ہوئی ہے اور مجھ جیسے کم صلاحیت انسان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں کہ ایسے اہم معاملہ پر قلم اٹھائے لیکن صرف اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رحمت کے بھروسے ہم نے یہ مخاطبت شروع کی ہے شاید کہ وہ کوئی مفید نتیجہ پیدا کر دے۔

آپ نے اپنی تحریرات میں متعدد جگہ اس طرح کا اعادہ کیا ہے کہ یہ کام ہم نے اللہ کے لیے اور اللہ کے ہی بھروسہ پر شروع کیا ہے اگر مجھ سے غلطی ہو رہی ہے تو وہ میری اصلاح کر دے۔ نیز آپ نے اس طرح کے اختلاف پر بھی فراخ دلی کے ساتھ غور و خوض کرنے کا علی الاعلان اطمینان دلایا ہے جو خلوص پسندی اور نیک نیتی پر مبنی ہو،

اور ہم اس بات پر پوری طرح مطمئن ہیں کہ آپ نے واقعتاً ایسے مواقع پر کسی طرح کی تنگدلی کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ میں نے دین کا ابتدائی شعور تبلیغی جماعت سے حاصل کیا۔ اب تک میرا تعلق اس جماعت سے قائم ہے اللہ اس کو قائم رکھے اور اس سے زیادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرا گہرا ربط جماعت اسلامی سے بھی پیدا ہو چکا ہے اور اب میرا زیادہ وقت اسی جماعت کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ میں محسوس نہیں کرتا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی اب ایک زندہ جماعت ہے اور دیندار طبقہ کی نگاہ بھی اب اس طرف مرکوز ہو رہی ہے۔ لیکن جو بات کہ میرے نزدیک انتہائی افسوسناک ہے وہ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کی کشاکش ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں اپنے تبلیغی احباب سے جو اُس حلقہ میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، گفتگو کی اور بالکل بے تکلفانہ یہ اعتراض کیا کہ آپ غیر مسلموں کے قبولِ اسلام اور ہدایت کے لیے دعا کر سکتے ہیں لیکن آپ کے دل میں وسعت نہیں ہے تو صرف جماعت، اسلامی کے لیے۔ آپ ایک فاسق و فاجر مسلمان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح کے لیے ہر طرح کی محنت کر سکتے ہیں اور مشقت اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی ہر بداخلاقی اور ٹھوکر کو برداشت کر سکتے ہیں لیکن جماعت اسلامی جو آپ کی نگاہ میں گمراہ ہے وہ قابلِ توجہ نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت آپ کے نزدیک ہے۔ ان سے ملنا، ان کی باتوں کو سننا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو سمجھنا بھی آپ کے نزدیک گمراہی کو دعوت دینا ہے ــــ لیکن اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے احباب کی حالت بھی اس لحاظ سے اُن سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ ہم اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ تبلیغی لوگوں کو دیکھ کر ان میں ایک حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں بات نہیں آتی کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہم نے ہر چند ان سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ تبلیغی

جماعت دین ہی کی تبلیغ تو کرتی ہے، کوئی بددینی تو نہیں پھیلاتی۔ اگر صرف کلمہ اور نماز کی ہی حد تک مان لیا جائے تو کیا یہ دین کی تبلیغ نہیں ہے۔ کیا یہ بنیادی چیز نہیں ہے جس کے بغیر کوئی مسلمان خواہ وہ علم و عمل کے کسی مقام پر ہو، زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا ان کی شب و روز کی محنتیں خالصتاً لوجہ اللہ نہیں ہیں۔ ہم نے مانا کہ ان کے دماغ میں وہ وسعت نہیں ہے لیکن ایک کمزور اور نحیف شخص کی کمزور سی محنت جو دین کے لیے ہو کیا یہ اللہ کی بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ ایک سادہ لوح انسان جو اپنی تمام بیوقوفیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے اُس کے دین کی سربلندی کی کوشش کرے وہ شاید اس اعتبار سے بڑھ جائے گی کہ اس میں آمیزش کا امکان نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ایک ذی علم اور باصلاحیت انسان کے اس توشۂ معاد میں آمیزش کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنے علم و عمل اور عقل و حکمت پر کبر آ سکتا ہے۔

بہرحال یہ بات تو اپنے اپنے لیے ہوئی۔ جہاں تک دینی مفاد کا تعلق ہے۔

معلوم میرا یہ خیال کس حد تک صحیح ہے کہ ایسے ہی لوگ اگر ان کے ذہن میں اسلامی نظام کی اہمیت پیدا ہو جائے تو میرے لیے مُمِد ہو سکتے ہیں۔ ایسا مخلص گروہ جو اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کی ہوس نہ کرے بلکہ جو کچھ سوچے سمجھے اور چاہے وہ صرف آخرت کے لیے اس سے زیادہ مفید انسان بنے بنائے اور کہاں مل سکتے ہیں۔ ہم اس پر اصرار تو نہیں کر سکتے لیکن اپنے علم و فہم کی حد تک اس خیال کو بہت قریب پاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کا قیام ایسے ہی لوگوں پر تھا۔

میری اس مخاطبت کا اصل مدعا یہ ہے کہ اگر ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور ان کو بڑھ کر اپنا لینے کی کوشش کریں تو یہ کس حد تک ممکن العمل اور موجبِ خیر ہوگا۔

میرا یہ مقصد نہیں کہ ایک جماعت دوسرے میں ضم ہو جائے۔ نہیں بلکہ جو جس

طور پر کام کر رہا ہے کرتا جائے - اپنے اپنے حدود میں رہتے ہوئے ہم ان کے ہمدرد ہو جائیں اور وہ ہمارے دعاگو بن جائیں۔ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان سے اختلاف کا مٹ جانا ہی بہت بڑی چیز ہے۔

جواب - دوسری دینی جماعتوں کے متعلق میرا نقطۂ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور میں اس کا اظہار بھی کرتا رہا ہوں کہ جو جس درجہ میں بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے بسا غنیمت ہے۔ مخالفِ دین تحریکوں کے مقابلے میں دین کا کام کرنے والے سب حقیقت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور انہیں ایک دوسرے کو اپنا مددگار ہی سمجھنا چاہیے۔ رقابت کا جذبہ اگر پیدا ہو سکتا ہے تو اسی وقت جبکہ ہم خدا کے نام پر دوکانداری کر رہے ہوں - اس صورت میں تو بے شک ہر دوکاندار یہی چاہے گا کہ میرے سوا اس بازار میں کوئی اور دکان نظر نہ آئے۔ لیکن اگر ہم یہ دوکانداری نہیں کر رہے ہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ خدا کا کام کر رہے ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے سوا کوئی اور بھی اسی خدا کا کام کر رہا ہے - اگر کوئی کلمہ پڑھوا رہا ہے تو وہ بھی بہر حال خدا ہی کی راہ میں ایک خدمت انجام دے رہا ہے، اور اگر کوئی وضو اور غسل کے مسائل بتا رہا ہے تو وہ بھی اس راہ کی ایک خدمت ہی کر رہا ہے۔ آخر اس کو مجھ سے اور مجھے اس سے رقابت کیوں ہو اور ہم ایک دوسرے کی راہ میں روڑے کیوں اٹکائیں۔ کلماتِ خبیثہ کی اشاعت کرنے والوں کے مقابلہ میں تو کلمہ طیبہ پڑھوانے والا مجھے عزیز تر ہونا چاہیے۔ اور فسق و فجور پھیلانے والوں کے مقابلے میں احکامِ شرعیہ کی تعلیم دینے والا بھی مجھے محبوب ہی ہونا چاہیے۔

میں نے جماعتِ اسلامی کے کارکنوں میں بھی ہمیشہ یہی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے خلاف کسی روش کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں جماعت میں اس سے مختلف کوئی جذبہ و عمل پایا ہو تو مجھے تعیینِ مقام و اشخاص کے ساتھ اس کی خبر دیجیے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔

خاص طور پر تبلیغی جماعت کا چونکہ آپ نے ذکر کیا ہے اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اس جماعت کے حق میں بھی میں نے ہمیشہ اپنے دل میں جذبۂ خیر ہی کو جگہ دی ہے اور اپنی زبان و قلم سے اس کے لیے کلمۂ خیر ہی ادا کیا ہے۔ مولانا محمد الیاس مرحوم کی زندگی میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میوات کے علاقے میں ان کے ساتھ دورہ کر کے ان کے کام کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے کام میں جو پہلو میں نے خیر و برکت کے محسوس کیے تھے ان کا "ترجمان" کے ذریعے سے تفصیلی تعارف کرایا تھا اور جن پہلوؤں سے کوئی کمی یا تشنگی محسوس کی تھی، انہیں خاموشی کے ساتھ صرف مولانا مرحوم کی خدمت میں عرض کر دینے پر اکتفا کیا تھا[1]۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی مثال اس امر کی پیش نہیں کی جا سکتی کہ میں نے اس جماعت کے خلاف یا اس کے رہنماؤں کے خلاف کوئی بات کبھی کہی ہو یا لکھی ہو، یا جماعت اسلامی کے کارکنوں نے کبھی اس کے کام میں روڑے اٹکائے ہوں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تبلیغی جماعت کا رویہ میرے اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس سے بہت مختلف رہا ہے۔ اس کے عام کارکنوں ہی نے نہیں، اس کے اکابر تک نے جماعت اسلامی کے ساتھ متعدد مواقع پر ایسی روش اختیار کی ہے جس کی مجھے ایک دفعہ تحریری شکایت بھی کرنی پڑی ہے[2]، مگر انہوں نے کوئی اصلاح نہ کی۔ حال میں اس کے ایک ممتاز رہنما نے اپنے رسالے میں مجھ پر اور جماعت اسلامی پر پے در پے جو عنایات فرمائی ہیں وہ بھی آپ نے دیکھی ہونگی۔ پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں یہ حضرات جماعت اسلامی کے خلاف علماء دیوبند کے فتووں کی کاپیاں بھی بڑی تعداد میں پھیلا چکے ہیں۔ حالانکہ وہاں کی بڑھتی ہوئی بے دینی کی رَو کو روکنے کے لیے جماعت جو کوشش کر رہی تھی کوئی خیر خواہ دین اگر ان کوششوں میں اس کا ہاتھ نہ بٹا سکتا تھا تو کم از کم اسے اس موقع پر بے دینوں کے مقابلے میں اس جماعت کو زک پہنچانے کی کوشش تو نہ کرنی چاہیے تھی۔ ان ساری باتوں کے بعد اب

[1] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن شعبان ۵۸ھ (اکتوبر ۳۹ء)

[2] ملاحظہ ہو "رسائل و مسائل" جلد دوم صفحہ ۶۰۰ - ۵۹۲

آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ دشمنی کا ہاتھ تو اُدھر سے بڑھتا رہا ہے اور اب بھی بڑھا ہوا ہے۔ دوستی کا ہاتھ آخر کہاں جا کر اس سے ملے؟ افسوس کہ ان کے ہاں کا "اکرام مسلم" بھی فسق و فجور کے علم برداروں کے لیے ہے، ہمارے لیے نہیں ہے۔ اور کچھ نہیں تو یہ حضرات کم از کم یہی سوچیں کہ جس طرح وہ مجھے اور جماعت اسلامی کو مطعون فرماتے ہیں اگر اسی طرح میں بھی ان کو اور ان کی جماعت کو مطعون کرنا شروع کر دوں تو آخر کار اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ عام لوگوں کی نگاہ میں دونوں ہی ساقط الاعتبار ہو کر رہیں گے اور دین کا کام کرنے کے لائق نہ ہم رہیں گے نہ وہ۔ یہی کچھ نتائج دینی جماعتوں کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے اور ایک دوسرے کی بیخ کنی کرنے سے برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی تمام اہلِ دین کی عزت اور ان کا اعتماد عوام کی نگاہ میں ختم ہو جائے اور لادینی کی تحریکیں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں صبر کے ساتھ ان حملوں کو ٹالتا رہتا ہوں جو مجھ پر کیے جاتے ہیں اور جماعت کے لوگوں کو بھی صبر کی تلقین کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر میں ان حضرات کو مطعون کرنے پر اتر آؤں تو ان میں سے کوئی صاحب بھی زبانِ وحی سے کلام نہیں فرماتے ہیں کہ گرفت کرنے کے لیے کہیں کوئی گنجائش مجھے نہ مل سکے۔

(بقیہ مطبوعات) اُن کی تحریریں میں عالمانہ اور محققانہ شان تو ضرور موجود ہے مگر اُن میں جذبات بہت کم جگہ پاتے ہیں۔ اس کتاب میں مطالعہ کی وسعت اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ جذبات کی حدت بھی ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے جہاں دماغ کو اطمینان ہوتا ہے وہاں دل کو بھی گونا گوں تسکین محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے فکر و جذبہ کو اس خوبی سے آپس میں سمو دیا ہے کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تبصرہ نگار کی نظر میں یہی اس کتاب کی سب سے امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے بڑی ہی قابلِ قدر ہے اور ہم اسے نہ صرف نامسلموں اور نومسلموں کے لیے نعمتِ عظمیٰ سمجھتے ہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ (ع - ح)

مطبوعات

انٹروڈکشن ٹو اسلام اسلام کا تعارف	انگریزی - از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب - صفحات ۲۰۰ - تقطیع بڑی قیمت پانچ روپے - پتہ: (۱) حبیب اینڈ کمپنی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد (ہند) (۲) مصطفےٰ احمد

صاحب معرفت عبدالاحد صاحب انصاری مکان نمبر ۶۷۶/۸ وٹھل بھائی روڈ (۲۲۳) ناظم جناح کالونی - کراچی نمبر ۵ -

اسلام کے مشہور محقق جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں - دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت میں جو مخلصانہ جد و جہد وہ کر رہے ہیں اُس کا اجر آخرت میں تو انشاء اللہ انہیں ملیگا ہی، لیکن اُن کی یہ بے لوث سعی اس دنیا میں بھی لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے - زیرِ تبصرہ کتاب اُن کے علم و اخلاص کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے -

انگریزی زبان میں اگرچہ اسلام پر بیشمار کتابیں مسلموں اور غیر مسلموں کے قلم سے لکھی جا چکی ہیں لیکن کوئی ایسی جامع تصنیف موجود نہ تھی جو غیر مسلموں کی پوری طرح رہنمائی کر سکتی - ڈاکٹر صاحب ساری امتِ مسلمہ کی طرف سے جزائے خیر کے مستحق ہیں کہ آخر انہوں نے اس فرض کفایہ کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا - اس کتاب کے پندرہ ابواب میں وہ سب کچھ خوش ترتیبی اور خوش اسلوبی سے سمیٹ دیا گیا ہے جس کی ضرورت کسی انگریزی دان نو مسلم کو پڑ سکتی ہے - چند عنوانات یہ ہیں :-

(۱) سوانح رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم (۲) محفوظیت تعلیمات اسلامی (۳) اسلام کا تصورِ حیات (۴) ایمانیات و معتقدات (۵) عبادات (۶) سیاسیات اسلامی (۷) اسلامی معاشیات (۸) تاریخ اسلام --- ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جو اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے وہ بھی اُن کی دوسری تصنیفات سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے - فاضل مصنف کا رجحان چونکہ تحقیق کی طرف زیادہ ہے اس لیے

(باقی پچھلے صفحہ پر)

خالی صفحه

تحریکِ اسلامی
دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل میں
از

نعیم صدیقی

مغرب کی جدید تہذیب الحاد، سرمایہ دارانہ جمہوریت، سوشلزم اور فاشزم جیسی تحریکات نے اب تک انسان کی مشکلات کو حل کرنے کی جو کوشش کی ہے۔ اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہیں۔ انسانی معاشرے میں کسی طرح کی اصلاح کے بجائے عظیم فساد پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے جو حل پیش کیا ہے۔ وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں موجودہ دور تہذیب کے نظریات و تحریکات کا تفصیلی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ ان نظریات میں کیا کیا مفاسد ہیں اور انسانیت کے لئے اسلام ہی کیوں راہ نجات ہے۔

ضخامت ۸۴ صفحات　　　　قیمت ۰ - ۲ - ۱

ہماری دوسری نئی مطبوعات

۱ - اپنی اصلاح آپ از نعیم صدیقی

یہ انفرادی تعمیر سیرت اور تزکیہ نفس کے موضوع پر نعیم صدیقی صاحب کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جو تقریر کی شکل میں جماعت اسلامی حلقہ لاہور کے ایک ہفتہ وار اجتماع میں پیش کیا گیا تھا۔

۳۶ صفحات　　　　قیمت ۹ - ۶ -

۲ - ہاتھیوں والے　مصنفہ محمد عبدالحی

۳ - باغ والے　"　"

۴ - انقلاب　"　"

۵ - خاموش تبلیغ　"　"

یہ کتابچے ادارہ الحسنات رامپور کے شائع کردہ بچوں کے سیٹ کی کڑیاں ہیں جو پہلی مرتبہ شائع کی جا رہی ہیں۔

قیمت ٦ - ٦ - ۰ فی کتابچہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

و سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی زیر مسلم مسجد

چوک انارکلی - لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس - لاہور